قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد ۸
شمارہ ۱۴

کراچی: ہفتہ ـ ۷ ـ مئی ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تمام انسانی (اجتماعی و انفرادی) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے عقل کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو خارجی روشنی کی۔

۲ یہ وحی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی اب قرآن کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے خلاف ہوں وہ اس کے خلاف ہیں غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرم کی انسانی سیرت کو ایک روشن اور مکمل نمونہ ہے ... ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہوتی ہو ... حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بہترین نظام انسانی ایک عالمگیر برادری کے افراد میں ہمواری کے قیام کی شکل ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس نظام کو نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کو قرآن کی رو سے ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸ ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت متشکل ہو جائے جس میں صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو سکے اور اسطرح زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں
تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

قرآن نے کیا کہا؟

سورہ یوسف کی یہ آیت ہمارے سامنے آجکل ہے وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون (۱۲/۱۰۶) ـ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ ایمان کے دعویدار ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں ـ آئیے دیکھیں کہ ایسے لوگ کون ہیں جو مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود قرآن کی رو سے مشرک رہتے ہیں ـ سورہ روم میں ہے ـ ولاتکونوا من المشرکین ـ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً ـ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱) دیکھنا! تم نے کہیں مشرکین میں سے نہ ہوجانا ـ یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کرلئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے ـ پھر ہر فرقہ خوش ہے کہ جس مسلک پر وہ ہے حق و صداقت کا مسلک ہے (اور باقی سب غلطی پر ہیں) ـ

لہٰذہ قران کی رو سے دین میں فرقے پیدا کرلینا شرک ہے ـ

اس شمارے میں

★ نظام ربوبیت ★ معاشی ناہمواریاں ★ پی ـ آئی ـ ڈی ـ سی ★ نمائش ★ تاریخی شواہد

★ اسلام کی سرگزشت ★ مجلس اقبال ★ ابن جریر طبری ★ سنت کی صحیح حیثیت ★ بزم طلوع اسلام

★ نقد و نظر ★ باب المراسلات ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

تازہ پیشکش

✡ اقبال اور قرآن

علامہ اقبال کے قرانی پیغام کے متعلق

محترم پرویز صاحب

کے دلکش مضامین اور انقلاب آفریں تقاریر کا مجموعہ ۔

اقبال کے سمجھنے کے لئے

اس سے بہتر کتاب آپکو بمشکل مل سکیگی ۔

ضخامت اڑھائی سو صفحات سے زیادہ ۔

قیمت ڈسٹ کور کے ساتھ صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ہے انہیں کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔

اگر وہ کتاب نہ لینا چاہیں تو اسکی بابت جلد اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی ۔ ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ہفتہ وار

جلد ۸ | ۷ مئی ۱۹۵۵ء | نمبر ۱۴

نظامِ ربوبیت

(در تسلسل اشتراکیت اور اسلام)

سابقہ اشاعت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ کمیونزم کس طرح نوع انسانی کے لئے تباہی کا موجب اور اسلام کے مد مقابل ایک بے خدا دینی تحریک ہے اور اس کے پیش کردہ تصور حیات کی رو سے کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ کمیونزم نے انسانیت سوز مادی تصور حیات کو کس طرح حق کے نقاب میں چھپا کر پیش کیا ہے۔ یہ حق کا نقاب وہ معاشی نظام ہے جسے وہ سرمایہ پرستی کے نظام کے مقابلہ میں سامنے لاتے ہیں۔ اس نظام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ جمہور کی اجتماعی اور مشترکہ تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ ان سے تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ اشتراکیت کے اس نگاہ فریب نقاب نے جہاں ایک طرف یہ نقصان پہنچایا ہے کہ یہ مادی نظریۂ حیات کی اس طرح پردہ پوشی کر دیتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کے جوش میں وہ کس تباہی کے جہنم کی طرف بہے جا رہا ہے۔ دوسری طرف اس نے یہ صورت بھی پیدا کر دی ہے کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کی مذمت اور غریبوں اور محنت کشوں کی حمایت میں کچھ کہا، مفاد پرست گروہ نے فوراً کہنا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ خصوصیت صرف کمیونزم کو حاصل ہے کہ وہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت کرے۔ کمیونزم کے علاوہ ہر نظام زندگی اور تصور حیات، سرمایہ داری کے حق میں ہے۔ حتیٰ کہ اسلام بھی سرمایہ داری کے نظام کا مؤید ہے۔ ان حضرات کی یہ روش خود کمیونزم کو اس قدر تقویت پہنچا رہی ہے کہ مسلمان نوجوان کشاں کشاں اس کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کی ہلاکت خیزیاں اس قدر نمایاں ہو چکی ہیں کہ بجز ان لوگوں کے جن کی ذاتی مفاد پرستیاں انہیں اس سے وابستہ رکھنے پر مجبور کر رہی ہوں، کوئی صاحب قلب سلیم اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ نوجوان طبقہ سنتا ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے نظام کی مخالفت نہیں کرتا تو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں پاتا کہ وہ کمیونزم کی آغوش میں جا گرے۔

اب کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک اور روش چل پڑی ہے اس کا نام ہے اسلامک سوشلزم۔ اس اصطلاح کے استعمال کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نظری طور پر نظام سرمایہ داری کی پوری پوری مخالفت کرتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی کمیونزم کو بھی اسلام کے نقیض قرار دیں گے۔ اس کے بعد بڑے فخر اور طمطراق سے کہیں گے کہ اسلام خود ایک سوشلزم کا نظام ہے۔ جس میں نہ نظام سرمایہ پرستی کی تباہ کاریاں ہیں اور نہ ہی کمیونزم کی انسانیت سوز گمراہیاں۔ یہ ان دونوں سے الگ، اپنا معاشی نظام رکھتا ہے جو تمام نوع انسانی کی مشکلات کا نہایت معقول حل پیش کرتا ہے۔ اس تمام دھوئیں دار تقریر اور خطیبانہ تحریر کے بعد جب آپ ان سے پوچھئے کہ اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے۔ ذرا اس کی تفاصیل بتائیے۔ تو آپ حیران ہوں گے کہ ان کے ذہن میں صدقہ و خیرات اور اڑھائی فیصدی زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔ اور جب آپ ان سے کہیں کہ صاحب! اس سے نوع انسانی کی اقتصادی مشکلات کا حل کس طرح سے ہو جائے گا، تو اس کے جواب میں وہ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔

یہ ہے وہ صورت حالات جس سے ہماری قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سخت پریشان ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کدھر جائے۔ ہمارا دور، معاشی دور (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ اس میں معاشیات نے اتنی اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ ویسے بھی معیشت، انسان کی حیات ارضی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کے متعلق صحیح پوزیشن کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔ پاکستان میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی انداز نظام زندگی کی تجربہ گاہ بنے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، قائد اعظم مرحوم نے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں (جو انہوں نے اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی سنہ ۱۹۴۸ء کو کراچی میں کی تھی) فرمایا تھا:

"مغرب کے اقتصادی نظام نے نوع انسانی کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا حل بمشکل مل سکتا ہے اور ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کو جس تباہی کا سامنا ہے اس سے اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ یہ نظام اس باب میں سخت ناکام رہا ہے کہ مختلف افراد میں عدل کیا جا سکے اور اقوام عالم میں باہمی تصادم نہ پیدا ہو۔ اس کے برعکس، گذشتہ پچاس سال میں جو دو مہیب عالمگیر لڑائیاں ہوئی ہیں اس کی بیشتر ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اقوام مغرب، اپنی مشینی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود، جس پریشان حالی میں ماخوذ ہیں اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس اہم فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوع انسانی کی بہبود، مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

قائد اعظم مرحوم کی عمر نے ایفا نہ کی اس لئے انہیں یہ بتانے کی بھی فرصت نہ مل سکی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے اور اس "عدل عمرانی" کی تفصیل کیا ہے جس کی طرف انہوں نے اجمالاً اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں پاکستان کے ارباب حل و عقد بھی عدم تعین کے اس دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں تشکیل پاکستان کے وقت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور پاکستان کی سفارشات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مملکت کا اقتصادی نظام پچیس سال تک "کتاب و سنت" کے دائرہ سے باہر رہے گا۔ اس لئے کہ نہ خود انہیں معلوم تھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہوگا اور نہ ہی اسے ارباب شریعت متعین کر کے دے سکے تھے۔

طلوع اسلام کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دیکھے اور بتائے کہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کے متعلق قرآن کریم کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اس سوال کو بھی اپنی فکر و تحقیق کا موضوع بنایا کہ قرآن کی رو سے نوع انسانی کا اقتصادی نظام کیسا ہونا چاہیئے۔ اس باب میں اسکی قرآنی بصیرت اسے جن نتائج تک پہنچا سکی ان کا ذکر مختلف

اوقات میں نجماً نجماً کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب اس پوری فکر کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، جس کا نام ہے نظامِ ربوبیت۔ طلوعِ اسلام، محترم پرویز صاحب کی اس کوشش کو، اس درخواست اور آرزو کے ساتھ بحضورِ ملت پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ اس پر نہایت سکون اور اطمینان سے غور کرے۔ اور اگر سمجھے کہ اس میں قرآن کے اقتصادی نظام کو صحیح طور پر پیش کیا گیا ہے تو پھر سوچے کہ اس نظام کو عملاً کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ نظامِ ربوبیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے اقتصادی نظام میں مملکت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے رزق کے سرچشمے (وسائلِ پیداوار) افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے ملت کی اجتماعی تحویل میں بطورِ امانت رہتے ہیں، اس لئے مفاد پرست حلقوں کی طرف سے یہ شور اٹھایا جائے گا کہ کمیونزم کی تبلیغ ہے۔ (چنانچہ ربوہ والوں نے تو ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طلوعِ اسلام کا تعلق روس کے ساتھ ہے اور یہی کچھ جماعتِ اسلامی والوں کی طرف سے مشہور کیا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پنجاب میں زرعی زمینوں کی ملکیت کا سوال زیرِ غور تھا تو مرزا بشیر الدین محمود صاحب اور سید ابوالاعلیٰ صاحب، دونوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھی تھیں کہ زمین پر بلا حدود انفرادی ملکیت عین اسلامی شریعت کے مطابق ہے۔ اور قانون کی رُو سے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینداریاں ختم یا کم کر دینا مداخلت فی الدین ہے) ہم طلوعِ اسلام میں بہ تکرار لکھتے چلے آ رہے ہیں (اور سابقہ اشاعت کے لمعات میں اس حقیقت کو پھر دہرایا جا چکا ہے) کہ ہمارے نزدیک کمیونزم اور اسلام ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور کوئی شخص جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہو وہ کمیونسٹ ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طرف سے یہ پروپیگنڈا ہوگا کہ طلوعِ اسلام کمیونسٹ ہے تاکہ لوگ اس کی طرف سے پہلے ہی بدظن ہو جائیں۔ اس بات کا ہمیں پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ طلوعِ اسلام نے یہ دعوت دی کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم ہونا چاہیئے۔ چونکہ اس نظام کے قیام سے مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہو جاتا تھا اس لئے انہوں نے طلوعِ اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ اگر اس مخالفت میں یہ حضرات طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی تعلیم کی تردید کرتے اور اسے غلط بتاتے، تو بھی ایک بات تھی لیکن یہ اسے غلط ثابت کر نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی مخالفت کا رُخ بدلا اور یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوعِ اسلام "منکرِ حدیث" اور "اہلِ قرآن" ہے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ لوگ طلوعِ اسلام کی قرآنی دعوت کی طرف آنے ہی نہ پائیں۔ اس طرح یہ لوگ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کو قرآنی دلائل سے تو غلط ثابت کر نہیں سکتے، اس لئے یہ پینترہ بدل کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے کمیونسٹ مشہور کر دیا جائے۔ "لیبل تراشی" ان حضرات کا قدیمی فن ہے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ معتزلہ ہے، یہ قدری ہے۔ یہ جبری ہے۔ یہ جہمی ہے۔ یہ مقلد ہے۔ یہ غیر مقلد ہے۔ یہ وہابی ہے۔ یہ دیوبندی ہے۔ یہ بریلوی ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ جس کی مخالفت مقصود ہو، اس پر ایک لیبل لگا دو اور اس طرح ذہنوں کا رُخ اصل حقیقت پر غور کرنے کی بجائے، دوسری طرف موڑ دو۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان "لیبلوں" کے اثر میں نہ آئیں بلکہ "نظامِ ربوبیت" میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس پر بچشمِ خویش غور کریں۔ کچھ عجب کہ ہماری اس کوشش سے اسلام کی وہ حقیقت آشکارا ہو جائے جس سے "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے" اور جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کی فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے۔

نظامِ ربوبیت کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں فرد کی زندگی اسٹیٹ کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اسٹیٹ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہے، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری نشوونما کے ذرائع بہم پہنچائے۔ جس سے وہ اس دنیا میں سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی میں حیاتِ جاوید کا اہل بن سکے۔ نیز یہ نظام مستبدانہ طور پر خارج سے ٹھونسا نہیں جاتا بلکہ یہ ان انسانوں کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے جو اس پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں۔ نہ ہی اس کے قیام میں کوئی ایسا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے جو ان مستقل اقدار کے خلاف جائے جو اس نظام کی اس الاصول ہیں۔ "نظامِ ربوبیت" انہی نکات کی تشریح پیش کرتی ہے۔

معاشی ناہمواریاں

سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے اپریل کے آخری ہفتے میں انکم ٹیکس سے متعلق اعداد و شمار شائع کئے ہیں جو مالی سال ۱۹۵۰-۵۱ء سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تاخیر سے شائع ہونے کے بعد یہ اعداد و شمار چنداں مفید مطلب نہیں رہتے کیونکہ وہ ہماری اس معاشی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو چار سال پیشتر تھی۔ اس دوران میں معاشی حالات میں ایسی نمایاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں کہ ان اعداد و شمار کو استنباطِ نتائج کی صحیح اساس نہیں بنایا جا سکتا۔ بورڈ نے اس تاخیر کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اعداد و شمار مرتب کرنے کا طریقہ بڑا پیچیدہ اور وقت طلب ہے۔ البتہ اس نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ اب کام کے دقیانوسی طریقوں کو خیرباد کہہ دیا گیا ہے اور مشینی ذرائع کو استعمال کیا جانے لگا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ آیندہ ضروری اعداد و شمار سال کے خاتمہ کے بہت دیر بعد شائع نہیں ہوں گے۔ غنیمت ہے کہ آٹھ سال میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے یہ راز سمجھ لیا کہ موجودہ "دورِ رفتار" میں اس ڈگر پر قائم نہیں رہا جا سکتا جس پر وہ آبا و اجداد کے ادوقت سے قائم چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خوش کن وعدہ کس حد تک ایفا پذیر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جائے گا کہ ان اعداد و شمار کی آئندہ قسط متعلقہ سال کے خاتمہ کے کتنی دیر بعد شائع ہوتی ہے۔

چار سال پیشتر کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۱،۱۱۸ نئے انکم ٹیکس دینے والوں کا اضافہ ہوا۔ (اس تعداد میں وہ تنخواہ دار شریک نہیں جن کا انکم ٹیکس ہر مہینے تنخواہوں میں سے کٹ کر سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتا ہے) گویا گیارہ ہزار سے اوپر ایسے نئے افراد پیدا ہو گئے جن کی آمدنی بڑھ کر ٹیکس کی زد میں آگئی۔ یہ نتیجہ ہے تجارتی اور صنعتی ترقی کا جو بجائے خویش بڑی قابلِ ذکر اور اہم ہے۔ لیکن اس ترقی سے عوام الناس کو کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہنچا۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف ۲۲۷۶۱ افراد کی مجموعی آمدنی ۰۰۰،۵۰،۹۰۵ روپے تھی وہاں ۲۸۱ افراد کی مجموعی آمدنی ۰۰۰،۰۰،۴۳،۱۵ روپے تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں تجارت اور صنعت سے جو آمدنی ہوئی وہ معدودے چند ہاتھوں تک محدود رہی۔ بیشتر افراد ایسے ہیں جن کے معیارِ زیست میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ اس ترقی سے فائدہ اٹھانے والوں کا دوسرا گروہ بڑی بڑی کمپنیوں کا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کمپنیوں کی آمدنی مجموعی طور پر ۰۰۰،۰۰،۲۶،۱۶ روپے تھی جس میں سے بڑی کمپنیوں کی آمدنی ۰۰۰،۰۰۰،۳۳،۱۴ روپے یعنی کل آمدنی کا ۸۲ فی صدی تھی۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ کمپنی چھوٹی ہو یا بڑی اس کی آمدنی چند افراد تک ہی محدود رہتی ہے۔ دونوں صورتوں میں عام حصہ داروں کو بہت کم منافع ملتا ہے گویا انفرادی طور پر دیکھا جائے تو کیا اور کمپنیوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کیا نئی پیدا شدہ دولت کی گردش عام نہیں ہوئی بلکہ وہ سمٹ سمٹا کر چند افراد کے پاس جمع ہو گئی ہے۔ اسی غلط تقسیمِ دولت کا نتیجہ ہے کہ صنعتی ترقی کا فائدہ عوام الناس کو کم سے کم پہنچا۔ مثال کے لئے صرف ایک کپڑے کی صنعت کو لیجئے۔ اس میدان میں پاکستان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ کپڑے میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کپڑا اتنا گراں ہے کہ اوسط درجے کی آمدنی والے افراد اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں امریکہ سے جو مالی مدد مل رہی ہے اس میں سے کروڑوں روپے غیر ممالک سے کپڑا منگوانے پر ضائع کرنے پڑتے ہیں۔ اگر صنعتی ترقی جلبِ منفعت کی بجائے ملی بہبود کے لئے ہوتی تو پاکستان کی معاشی حالت بہت بہتر ہوتی۔ ہم نے بارہا اس پر زور دیا ہے کہ افزائشِ دولت مقصود بالذات نہیں، نہ یہ دولت ان افراد کی ملکیت ہے جو اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس اساسی نکتہ کو آج تک نہیں سمجھا گیا اور نتیجہ معاشی ناہمواریوں کی صورت میں ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ جہاں دولت بڑھ رہی ہے وہاں غربت اور فلاکت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ہے بالکل قابلِ فہم۔ جب تک رزق کے سرچشمے ملت کی تحویل میں رہنے کے بجائے افراد کے ہاتھوں میں رہیں گے معاشرہ معاشی فساد ہی کا شکار رہے گا۔ قرآن اس حقیقت کو بار بار دہرا رہا ہے۔

اگر عوام سے ان دولت کمانے والوں کا یہ سلوک ہے تو حکومت کے بارے میں بھی ان کا رویہ کچھ کم قابلِ مذمت نہیں۔ مثلاً پیشِ نظر رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قاعدے کے مطابق ہر اس شخص کو جس کی آمدنی ٹیکس کے قابل ہو جائے، حکومت کو از خود یہ اطلاع دینی چاہیئے۔ لیکن ۱۹۵۰-۵۱ء میں کسی ایک شخص نے بھی ایسی اطلاع نہیں دی۔ چنانچہ جو رقم ٹیکسوں کی صورت میں وصول کی گئی ہے وہ محکمہ انکم ٹیکس کی کوششوں سے

وصول ہوئی ہے۔ رپورٹ میں مذکور ہے کہ دولت پیدا کرنے والے متنوع حیلوں سے ٹیکس کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ مثلاً وہ غلط حصہ داروں دکھاتے ہیں۔ کئی طرح کے حساب رکھتے ہیں۔ منافع کی رقوم کو اعزہ واقارب کے نام بینکوں میں جمع کر دیتے ہیں۔ خریدی ہوئی اشیاء کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ موجود سامان کی قیمت کم بتلاتے ہیں۔ غلط میزان لگاتے ہیں اور نقد بکری کا اندراج ہی نہیں دکھاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مستزاد رشوت ستانی ہے۔ لہٰذا یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ جس رقم پر حکومت کو ایک پائی کا بھی ٹیکس نہیں ملتا وہ بھی بڑی معقول ہوگی۔ گویا سرمایہ دار حکومت اور عوام دونوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور عوام اور حکومت دونوں تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ عوام بےبسی سے اور حکومت بےرغبتی سے۔

یہ رپورٹ پرانی ہی سہی لیکن یہ جس مرض کا پتہ دیتی ہے وہ ہمارے معاشرے کو اب بھی گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ پرانی رپورٹ بھی ہمارے اربابِ فکر و نظر اور اربابِ حکومت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونی چاہئے لیکن اگر اس سے علتِ مرض کا کماحقہٗ احساس نہ کیا گیا اور اس کا مداوا نہ کیا گیا تو ہماری معاشی ترقی ہمارے لئے معاشرتی مصیبت بن جائے گی۔ یاد رکھئے قومیں ذرائع و اسباب کی کمی سے تباہ نہیں ہوا کرتیں۔ دولت کی غلط تقسیم کے ہاتھوں ہلاکت کے جہنم میں پہنچا کرتی ہیں۔ ہمارے اس دعوے پر خدا کی شہادت کافی ہے

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا کارنامہ

تقسیم کے بعد پاکستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی کا میدان بالکل خالی تھا کیونکہ تقسیم سے پہلے اس پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا اور وہ پاکستان کی معیشت کو معطل کر کے اسے ناکام بنانے کے مذموم ارادہ سے ان علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے مسلمان سرمایہ داروں کے لئے یہ سنہری موقع تھا لیکن چونکہ ابتدائی زمانہ افراتفری کا سا تھا اس لئے نجی سرمائے کا ایک پیسہ بھی صنعتوں کی ترویج و ترقی کے لئے باہر نہ آیا۔ صنعتوں کو نظرانداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ادھر سرمایہ زیادہ لگتا تھا اور منافع کے لئے دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا چنانچہ محض مفادِ عاجلہ کے پیش نظر ہمارے سرمایہ داروں نے اپنا پیسہ تجارت میں لگایا اور غیر معمولی حالات سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا اور خوب ہاتھ رنگے۔ رفتہ رفتہ صنعتوں کی کمی کا احساس پیدا ہونے لگا اور حکومت نے اشیائے صرف کی درآمد کم و بیش بند کر کے اور سرمایہ داروں کو چند در چند مراعات دیکر صنعتی ترقی کی طرح ڈالی۔ ان مراعات کے باوصف مطلوبہ سرمایہ باہر نہ آیا۔ یہ حالات دیکھ کر حکومت نے صنعتی ترقی کے لئے ایک کارپوریشن (P. I. D. C.) مقرر کیا جس نے جنوری ۱۹۵۲ء سے آغازِ کار کیا۔ اس کارپوریشن نے دو سال کی مدتِ حیات میں قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ کارپوریشن نے ایسی صنعتیں ہی قائم نہیں کیں جو ساعد حالات میں نجی سرمائے سے قائم ہو جاتیں بلکہ ایسی صنعتیں بھی قائم کیں جن کی طرف نجی سرمایہ توجہ نہیں دیتا۔ کیونکہ ان کی حیثیت زیادہ تر تعمیری ہوتی ہے اور ان پر صرفہ زیادہ اٹھتا ہے اور منافع دیر کے بعد اور کم ملتا ہے۔ گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کارپوریشن میدان عمل میں نہ آتی تو ہم صنعتی ترقی نہ کر سکتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک تو کارپوریشن نے نجی سرمایہ داروں کے لئے عمدہ مثال پیش کی، اور دوسرے ایسی اساسی صنعتیں قائم کیں جو نجی سرمایہ داروں کے لئے کوئی دلکشی نہیں رکھتیں۔ ایسی صنعتیں ہر ملک میں حکومت ہی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہیں۔

اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کارپوریشن اپنے دو سال کے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس نے اس "نئے باب" کا اضافہ کیا ہے کہ کارخانے قائم کر کے اور کامیاب بنا کر نجی سرمائے داروں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اب تک چار چلتے کارخانے بیچ دیئے گئے ہیں۔ اس ذہنیت کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ان کارخانوں میں سرکاری اور پبلک کا ملا جلا پیسہ تھا اور ان کا فائدہ بالعموم ملک کو پہنچتا تھا۔ لیکن اب یہ سارے کا سارا منافع چند افراد تک محدود ہو جائے گا۔ اور افراد بھی وہ جو پہلے ہی دیگر صنعتوں سے کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔ اور یہ کیا اس لئے گیا ہے کہ ملّا نے ان کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ ذاتی ملکیت از روئے اسلام ایک مقدس حق ہے جسے محدود کر کے مسلمان دنیا و آخرت کی برکتوں سے محروم ہو جائے گا۔ ہم حیران ہیں کہ کارپوریشن کو اپنی محنت کو یوں ہی رائیگاں بنانا تھا تو اس نے یہ بھاڑ جھونکا ہی کیوں تھا۔ اگر اس جوئے شیر کو آخرالامر خسرو کے محل میں ہی پہنچنا تھا تو اس قدر جانگسل اور جگر خراش کوہ کنی کی ضرورت کیا تھی؟ وہ چندے انتظار کرتی تو جو صنعتیں اس نے چلائیں اور چلا کر نجی سرمایہ داروں کے گلہ الگتا دیں ٹانک دیں وہ اس کے بغیر بھی قائم ہو جاتیں۔ آخر کپڑے، جوٹ وغیرہ کے قابل رشک کارخانے بھی تو نجی سرمایہ داروں نے لگا ہی رکھے ہیں۔ کارپوریشن کو یہ پہلے ہی دن سے طے کر لینا چاہیئے تھا کہ وہ صرف ان کارخانوں کی طرف توجہ دے گی جو عام طور پر نجی سرمایہ سے نہیں بنتے۔ کارپوریشن نے اس غلط نگہی اور غلط بخشی سے ملک کے لئے معاشی ناہمواریوں کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ نجی سرمایہ داروں کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ کارپوریشن کے کارخانے ان کی تحویل میں دیدیئے جائیں۔ یہ مطالبہ ان سرمایہ داروں کا ہے جو اپنا پیسہ اس وقت دبائے بیٹھے تھے جب ملک کو ضروریاتِ زندگی کے لئے دنیا بھر کی منڈیوں کی خاک چھاننا پڑتی تھی۔ انہوں نے پیسہ پہلے تجارت میں لگایا اور جی بھر کر منافع خوری کی۔ پھر حکومت پر دباؤ ڈال کر اشیائے صرف کی درآمد بند کرا کے کارخانے کھولنے شروع کئے۔ عام صارفین اس پالیسی سے بہت پریشان ہوئے لیکن انہیں تسلی دی جاتی رہی کہ یہ قربانی ملک کی صنعتی ترقی کی خاطر کرنا ہی ہوگی۔ اپنے کارخانے چلنے کی دیر ہے ملک میں اشیائے ضروری کی ریل پیل ہو جائے گی۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ پاکستانی مصنوعات بازاروں میں آنا شروع ہوئیں۔ لیکن اس سے عجیب صورت پیدا ہو گئی۔ ضروریاتِ زندگی ممالک غیر سے درآمد کی جاتی تھیں تو وہ مناسب داموں پر خریدی بھی جا سکتی تھیں۔ اب جو پاکستانی اشیاء بازار میں آئیں اور عوام انہیں خریدنے کے لئے آگے بڑھے تو وہ ان کی قوتِ خرید سے کہیں باہر تھیں۔ چونکہ باہر سے مال آ نہیں رہا تھا اس لئے ناچار انہیں خرید ا گیا۔ اس سے غریب غریب تر ہو گئے اور کارخانے دار دیکھتے دیکھتے کروڑپتی بن گئے۔ اس طرح ملک کی دولت میں تو اضافہ ہوا لیکن وہ کارخانہ داروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ملک کے عوام کو اس تک پہنچنا تو ایک طرف وہ اور زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ اب پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے اپنی کارخانہ داروں کو چلتے چلائے کارخانے دیدیئے ہیں تاکہ رزق کے زیادہ سے زیادہ سرچشمے کم سے کم ہاتھوں میں مرکوز ہوں اور ملک معاشی جہنم کدہ بن جائے۔

ہم نے طلوعِ اسلام میں بارہا قرآنی نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قرآنی نظام میں رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کا کوئی جواز نہیں۔ (اس موضوع پر سیر حاصل بحث "قرآنی نظامِ ربوبیت" میں ملے گی جو ابھی ابھی ہم نے شائع کی ہے۔) اس سے جو معاشی فساد پیدا ہوتا ہے ہم آج اس میں مبتلا ہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ہمیں تو آج صنعتی ترقی کا موقع ملا ہے۔ یورپ جو گذشتہ دو سو سال سے صنعتی ترقی میں مصروف ہے اور جو ذاتی ملکیت کا زبردست نقیب ہے، اس کے ہاں بھی ذاتی ملکیت کا تصور عملاً ختم ہو گیا ہے، انگلستان، امریکہ وغیرہ میں ذاتی ملکیت پر زور دینے کے باوجود معاشی رجحان "اجتماعی" ہو گیا ہے۔ ان کا معاشی نظام صریحاً سوشلسٹ ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی انہوں نے بڑے تلخ تجربوں کے بعد پیدا کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر ہم قرآن کی راہنمائی کی طرف سے آنکھیں بند کئے تھے تو کم از کم ان ممالک کی مثال ہی اپنے سامنے رکھتے اور جو غلطیاں ان سے سرزد ہوئیں ان سے بچتے۔ لیکن ہمارے اندھے پن کا یہ عالم ہے کہ ہم اس جہنم سے گذرنا چاہتے ہیں جس سے وہ قومیں گذر چکی ہیں۔ اور تو اور ہندوستان تک نے اپنی معاشی سمت سوشلسٹ کر دی ہے اور وہاں آئین بدلا جا رہا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر معاوضہ دے کر املاک پر قبضہ کیا جا سکے۔ ہندوستان کے وزیرِ داخلہ پنڈت پنت نے ان دنوں اس سلسلہ میں پارلیمان میں یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم اپنی بڑی بڑی سکیموں کو طویل عدالتی بحثوں کے باریک جالوں کی وجہ سے روک نہیں سکتے ہم ان امورِ مہم کو سیدھے سیدھے سرانجام دیں گے۔" ہندوستان جیسے ذاتی ملکیت کے حامی ملک میں تو عدالت تک کو ذاتی ملکیت کی تحدید سے روکنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن ہمارے ہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے اور اچھے خاصے قومی اداروں کو ذاتی

ملکیتوں میں دیا جا رہا ہے، یہ دیکھتے اور جانتے ہوئے کہ ذاتی ملکیت نے کیا اودھم مچا رکھا ہے۔

ہم کارپوریشن اور حکومت دونوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ خدا کے لئے اس تباہ کن پالیسی کے نتائج پر غور کریں اور ملک کو اس عذاب سے بچائیں جس میں وہ مبتلا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یاد رکھئے یہی وہ غلط اقدامات ہیں جو کمیونزم جیسے انسانیت سوز نظام کے لئے فضا سازگار کیا کرتے ہیں جس سے کوئی مقدس قدر سلامت نہیں رہا کرتی فھل من مدکر۔

نمائش!

یوں تو پاکستان کی آٹھ سالہ زندگی کو سمیٹ کر سامنے لایا جائے تو اس کی صحیح تعبیر کے لئے ایک لفظ "نمائش" کافی ہوگا ــــ علم و حکمت کی اس بہرہ بازی میں، بحث و تکرار کی نمائش۔ مکتب و مدرسہ میں پرانے افکار کی نمائش۔ معاشیات و اقتصادیات میں، خطوط حمدار کی نمائش، مرمزد کھدار کی نمائش۔ سیاسیات میں، ہوس کی خونریزیاں چھپانے کو، عقلِ عیار کی نمائش۔ لیکن بعض اوقات یہ نمائش اس قدر بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کا نمائشی لطف بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ دارالحکومت کراچی میں صنعتی اور انجنیری منصوبوں کی ایک "مستقل نمائش" قائم کی جائے گی تاکہ عوام کو بتایا جائے کہ حکومت کے پیشِ نظر "کون کون سے پروگرام اور کونسی کونسی تجاویز ہیں۔ اس "مستقل نمائش" پر قریب دس لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ کراچی کے بعد پھر اس قسم کی "مستقل نمائش" ڈھاکہ میں بھی قائم کی جائے گی۔

یہ نمائشیں کیوں قائم کی جائیں گی؟! اس لئے کہ امریکہ میں اس قسم کی نمائش گاہیں قائم ہیں:

اگر ہمارے ملک میں کوئی باہوش طبقہ ایسا ہے جس کی آواز ان محلات شاہی میں بسنے والوں کی خوابگاہوں تک پہنچ سکتی ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان حضرات کے کانوں تک زمانہ کی یہ تلخ حقیقت پہنچا دیں کہ بھوکے کا پیٹ روٹی سے بھرتا ہے، چولھے چھیٹے۔ توے۔ پرات کے نقشوں سے نہیں بھرتا۔ قوم ایک ایک پیسے کو ترس رہی ہے۔ لاکھوں انسان زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو رہے ہیں اور ہمارے یہ تخیلات کی جنتوں میں بسنے والے اربابِ نظم و نسق ہیں کہ لاکھوں روپیہ نمائش گاہوں کی تعمیر پر صرف کرنے کی سوچ رہے ہیں! اور سوچ اس لئے رہے ہیں کہ "امریکہ میں ایسی نمائش گاہیں بنی ہوئی ہیں"! انہیں کون بتائے کہ امریکہ کی دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اسے دنیا بھر کے گداگروں کی جھولیاں بھرنے کے بعد لاکھوں من اشیائے خوردنی سمندر میں ڈبونی پڑتی ہیں آپ ان کی ریس کر کے یہاں نمائش گاہیں بنوا رہے ہیں؛

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ   مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت   دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی   دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
ان کے نفس میں کا غذ کے پھول رکھنے سے بالآخر کب کام چلے گا؟!

"صالحین" کے انداز

ملک کے موجودہ آئینی انتشار میں جماعت اسلامی کا مسلک یہ چلا آ رہا ہے کہ جس بات سے حکومت کو زک پہنچے اسے خوب خوب اچھالا جائے، چونکہ اس ضمن میں عدالتوں کی طرف سے بالعموم ایسے فیصلے صادر ہوتے رہے، جن سے حکومت کی پوزیشن کمزور ہوتی تھی اس لئے ان حضرات کی طرف سے شور مچایا جاتا رہا کہ قانون کا احترام سب سے مقدم ہے۔ عدالتوں کے فیصلے کے سامنے ہر ایک کا سر جھکنا چاہیئے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کان میں کہیں سے (شاید) یہ بھنک پڑ گئی ہے کہ فیڈرل کورٹ گورنر جنرل کے حق میں فیصلہ دیدے گی۔ اس لئے اب عدالت کے فیصلے اور قانون کا احترام سب دریا برد ہو رہے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ

> فیڈرل کورٹ نے اگر دستوری کنونیشن کے حق میں رائے دیدی اور گورنر جنرل کے لئے دستوریہ کی تحلیل کا حق تسلیم کر لیا۔ تو یقیناً قانونی لحاظ سے اس کو صحیح پوزیشن قرار دیا جائے گا۔ اور ہر شخص اس کے آگے سرِ تسلیم خم کریگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سے عوام کی آزادی اور اپنا دستور آپ مرتب کرنے کے بنیادی حق کی نفی نہیں ہوگی!؟ ہمیں تعجب ہے کہ اگر ایک مستقل نفذ کی موجودگی جمہوریت کی نفی ہے تو دستوریہ کی تحلیل اور دستور کی منظوری کے اختیارات کا ایک فردِ واحد کے ہاتھ میں مرکوز ہونا کس طرح جمہوریت کی روح کے مطابق ہے!؟
>
> (تسنیم۔ یکم مئی ۱۹۵۵ء)

یعنی اگر کورٹ نے ان حضرات کی منشا کے مطابق فیصلہ دیدیا تو اس فیصلے پر عملدرآمد جمہوریت کی روح کے عین مطابق ہوگا۔ لیکن اگر اس کا فیصلہ حکومت کی منشاء کے مطابق ہوا تو اس کے مطابق عمل کرنا جمہوریت کی روح کے منافی ہوگا۔

مذکورہ بالا اقتباس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختیارات کا کسی ایک فردِ واحد کے ہاتھ میں مرکوز ہونا جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ اس ضمن میں اس سے ذرا پہلے تو یہ ہے کہ

> جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گورنر جنرل کو یہ اختیار پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے کہ دستوریہ کے منظور کردہ ہر قانون پر اس کی منظوری ضروری ہے تو دستوریہ کی کمزور حیثیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

یعنی اگر کسی مجلس آئین ساز کے پاس کردہ مسودہ پر رئیسِ مملکت کی منظوری ضروری ہو تو ان حضرات کے نزدیک یہ چیز بھی جمہوریت کے خلاف ہوگی۔ اور چونکہ یہ حضرات بہرحال اسلام کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے مدعی ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک یہ چیز خود اسلامی دستور کے بھی خلاف ہوگی۔ لیکن اسی اسلامی جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جو دستوری خاکہ مرتب فرمایا تھا اس میں رئیسِ مملکت کے متعلق ارشاد تھا کہ

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے۔ یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہوگا کہ وہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے کا پر فیصلہ کرے۔

کیا جماعت اسلامی کا ترجمان (تسنیم) بتائے گا کہ ان کے امیر کا مندرجہ صدر فیصلہ جمہوریت (اور اسلام) کی روح کے مطابق ہے یا اس کے مخالف؟۔

لیکن اس جماعت کے نزدیک اس قسم کے متضاد فیصلوں میں تطبیق بھی کچھ مشکل نہیں۔ تطبیق کی آسان صورت یہ ہے کہ جب غلام محمد رئیسِ مملکت ہو۔ تو وہ فیصلہ (جس کی رو سے مجلسِ آئین ساز کے پاس کردہ قانون پر اس کی منظوری کی ضرورت نہیں) اسلام کے مطابق ہوگا۔ اور جب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب رئیسِ مملکت ہوں تو پھر یہ فیصلہ (کہ وہ پوری مجلس آئین ساز سے اختلاف کر کے اپنا فیصلہ دے سکتے ہیں) اسلام کے مطابق ہوگا۔ یہ دین کے وہ رموز ہیں جنہیں آپ اور ہم عامی بالکل نہیں سمجھ سکتے۔

غیروں کی نظروں میں

گزشتہ چند دنوں سے مملکت پاکستان میں جو قانونی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق ہم تفصیلی طور پر طوفان تھمنے کے بعد ہی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ملک میں جو ابتری پھیلی ہے۔ اس کے متعلق ایک غیر پاکستانی مبصر کا تبصرہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ شاید اسی سے ہماری آنکھیں کھل سکیں۔

مسٹر فلپ ڈین (PHILIP DEANE) آبزرور ٹائمز کے خاص تبصرہ نگار ہیں۔ انھوں نے ان کوائف پر بحران پاکستان کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> قریب ایک ہفتہ تک پاکستان ایک عجیب دنیائے خلفشار بنا رہا۔ جس میں حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ فوج کے اونچے افسر بلا خوفِ عقوبت اپنے کمانڈر انچیف سے کہہ سکتے تھے کہ حضور ہیں کس باغ کی مولی؟ کابینہ کے وزراء کو خود اپنے متعلق علم نہ تھا کہ قلمدانِ وزارت ان کے ہاتھ میں ہے یا چھن چکا ہے۔ غنڈے اور ڈاکو ٹھٹے دھڑلے سے پولیس سے اپنی رہائی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور ان سے معافیاں بھی منگاتے تھے یعنی اُلٹے چور کوتوال کو ڈانٹ رہے تھے۔ لوگ اس حقیقت کو ماننے سے انکاری تھے کہ ان کی مملکت کا دارالحکومت قانونی طور پر موجود ہے اور اس لئے اس کے احکام کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، سٹہ بازوں کے وارے نیارے تھے۔ کیونکہ پاکستان کا بھی قانونی تعین ہاتھ مختصراً یہ کہ آپ کو صرف ایک وکیل کی ضرورت تھی جس کی مدد سے آپ جس قدر گڑے مردے چاہے اکھاڑ سکتے تھے۔
>
> (ٹائمز آف کراچی۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۵۵ء)

اس حقیقت حال پر ہم سوائے اس کے کہ اپنی نگاہیں زمین میں گاڑ لیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ قانون کا احترام قوموں کی سربلندی اور سرفرازی کا موجب ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہاں قانون ہی کے احترام کی آڑ میں مفاد پرستوں نے جو دھاندلی مچائی ہے اس سے ہماری قوم کا وقار ذلت کے عمیق گڑھے میں جا گرا ہے۔ یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً۔ وما یضل بہ الا الفٰسقین الذین .... یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض

تاریخی شواہد

(۱۳)

اس "من المسلمین" کے شرف پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقام نبوت اور یہی وہ چیز ہے جس میں صحیح اختیار کی پوری شان جلوہ ریز ہوتی ہے پر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسول کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلۂ زریں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ انسان اسی گرامی مرتبت خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیل شرف انسانیت کا راز ہے اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضور ختمی مرتبتؐ کے عہد ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستان قدسی درحقیقت اسلام اور امتِ مسلمہ ہی کی داستان ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے اہم صاحبیہ آئے جن کا ذکر جلیل آیندہ اوراق کے لئے وجۂ زینت ولایۂ افتخار ہوگا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء میں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل سے اور اُن سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ (۱۷/۳)

اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا وہ ایک عبد شکور تھا۔

ان ہی کی نسل آگے بڑھ کر مختلف ندیوں اور دریاؤں کی صورت میں صفحۂ ارض پر پھیلی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ۝ (۳۷/۷۷)

اور ہم نے اسی نسل کو باقی رہنے والوں میں سے بنایا۔

تاریخ کے اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال آہستہ آہستہ اسی مؤسس اولیٰ کی طرف لئے جارہے ہیں۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہد کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سردست ارباب نظر کے لئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (Deluge) کی داستانیں دنیا کے قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر کرتی ہے۔ یونان، ایران، ہندوستان، چین حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیر الاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصہ بڑے دل چسپ انداز میں...... مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی کے لئے غسل کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفان عظیم سے نجات دلادوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کرکے سمندر تک پہنچا دیا۔ اور اس کی ہدایات کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو وید وں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ بادستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفان بلا انگیز برپا کرکے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنے والے انکشافات ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدر مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصہ مذکور ہے اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصہ" نہیں۔ اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینہ میں تقدیر امم کے خطوط ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین میں اور کونسی نسل سے ہوئی؟ یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رخ اسی طرف ہے کہ اس کی ابتدا عراق کے علاقہ سے ہوئی۔ جہاں کی سامی نسل آنے والی تہذیب و تمدن کی مؤسس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ و فرات کی وادیوں میں آج سے قریب چھ سات ہزار سال پیشتر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قوم میں طبقات کی تقسیم اور پیشوں کے اعتبار سے تفریق و تمیز شروع ہو چکی تھی۔ ارباب اقتدار و ثروت نے اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت کی جو حکومت و اختیار اور رزق کے سرچشموں کو اُن سے چھین کر خدا کے قانون کے سپرد کر دینے کا مدعی تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور یوں دو محاذ بالمقابل پیدا ہوگئے جب ارباب سطوت و اقتدار کا جور و استبداد حد سے بڑھ گیا اور اس امر کا یقین ہو گیا کہ ان کا ناسور لاعلاج ہے تو مکافات عمل کے اٹل قانون کے ماتحت، حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کرکے بچا لیا گیا اور باقی سب نذر طوفان ہو گئے۔ مخالفین میں حضرت نوحؑ کا اپنا بیٹا بھی تھا اور آپ کی بیوی بھی۔ لیکن انہیں نبی کی قرابت داری اس ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکی جو ان کی سرکشی کا فطری نتیجہ تھا۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ درحقیقت حضرت نوحؑ کے "اہل" میں سے نہ تھے دنیا میں انسانوں کی تقسیم کا ایک ایسا بنیادی اصول سامنے کر دیا ہے جس نے نسلی، جغرافیائی، لسانی و وطنی حدود و قیود کو مٹا کر ساری تقسیم و تفریق حزب اللہ اور حزب الشیطان کے اصول پر رکھ دی ہے۔

قصۂ حضرت نوحؑ کی تفاصیل تورات میں بھی ہیں لیکن ان تفاصیل کو دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان میں ذہن انسانی کی افسانہ طرازیوں نے کس درجہ دخل اندازی کی ہے اور یوں آسمانی تعلیم کو کس طرح مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔

"طوفان" کا تذکرہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم کے اساطیر الاولین میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ مزید تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات تمام روئے زمین کی آبادی کی اصل کو شاید اس خطہ کی طرف مرکوز کر دیں جس میں طوفان نوحؑ برپا ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت نوحؑ نے جس تعلیم کی دعوت دی اس کی مخالفت قوم کے ارباب دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلیم محض "خدا کی پرستش" کے متعلق ہوتی تو اس کی مخالفت خصوصیت سے ارباب دولت و اقتدار کی طرف سے کیوں ہوتی "پرستش" کے معاملہ میں تو عوام سب سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں۔ یہ مخالفت ان کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ عوام تو اس دعوت کے ساتھ تھے اور اوپر کا طبقہ اس کا مخالف تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس سے ارباب دولت و اقتدار کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات انبیائے کرام جس انقلاب کی طرف دعوت دیتے تھے اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ رزق کے سرچشموں کو افراد کے پنجے سے چھڑا کر قانون خداوندی کے تابع کر دیا جائے تاکہ وہ تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی مخالفت ہمیشہ ارباب حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ قرآن نے سب سے پہلی دعوت میں اس کشمکش کا ذکر کیا ہے اور یہی کشمکش اس کے بعد ہر دعوت میں نظر آئے گی۔

اسلامی معاشرت
از پرویز
قیمت
دو روپے

باب المراسلات

روزوں کے احکام

اکال گڑھ (راولپنڈی) سے ایک صاحب کا حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے۔

طلوع اسلام مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۱ کالم ۳ میں روزوں کے قرآنی احکام پڑھے پیرا نمبر ۲، ۳، ۴ تک (ص) کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وھو ھذا:

قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ تمام مہینے کے روزے رکھے جائیں۔ اس میں تو صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ رمضان کے مہینے میں روزے رکھو مگر وہ صرف ایام معدودات ہیں۔ ایام جمع قلت و کثرت دونوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں معدودات کا لفظ اسکو قلت سے متعلق کر دیتا ہے۔ "گنے ہوئے" ہر زبان میں قلت کے معنوں ہی میں لئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ جمع قلت ہے۔ جس کا اطلاق تین سے نو تک کے اعداد کے لئے ہوتا ہے۔

قرآن میں ایاماً معدودات دوسری جگہوں میں بھی جمع قلت کے معنوں ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً لن تمسنا النار الا ایاماً معدودات۔ واذکروا اللہ فی ایام معدودات۔ اور حج کے ایام تین ہیں ثلاثۃ ایام فی الحج۔ فمن تعجل فی یومین۔ اس سے زیادہ اس کے جمع قلت ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ نیز تیس روزے تو پہلی امتوں میں کسی پر بھی نہیں۔ اور پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ الدین یسر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ تو یہ ایسی آسانی ہے کہ کئی لوگ اس روزے کے طفیل طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کئی تو جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جو دین پیش کیا جا رہا ہے وہ تو دین فطرت ہو نہیں سکتا۔ نماز میں ہیں تو ادھر سے نماز پڑھ کر آؤ پھر دوسری کا بلاوا آیا بیٹھا ہے۔ اسی کام میں لگے رہو۔ دنیا کا اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہوتا ہے تو یہ عبادت اس کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ نہ آدمی اچھا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور نہ موجودہ فیشن کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ..... ہیٹیل مانگے الشان بن کر ہے۔ بتلائیے ایسا دین کہیں چل سکتا ہے اور قابل عمل ہے؟

ممکن ہے آپ جمع کثرت یا تیس دنوں کے روزوں پر ہی اصرار کریں۔ لیکن جب ایک لفظ کے معنی آسانی کی طرف بھی لے جاتے ہیں تو آپ یسر کی بجائے عسر کی طرف کیوں جاتے ہیں اور لوگوں کو فتنے میں کیوں ڈالتے ہیں جیسا کہ احادیث میں لکھا ہے کہ آپ نے معاذ بن جبل کو لمبی قرأت پڑھنے پر منع فرمایا تھا کہ کیوں لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہو کہ لوگ نماز چھوڑ جاتے ہیں۔

طلوع اسلام | قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ تم رمضان کے مہینے میں چند دنوں کے لئے روزے رکھو۔ اس نے کہا یہ ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲:۱۸۵) یعنی جو تم میں سے اس مہینے میں اپنے مکان پر موجود ہو تو اسے چاہیے کہ اس مہینے کے روزے رکھے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روزے پورے رمضان کے مہینے کے ہیں۔ نہ کہ رمضان کے مہینے میں تین یا نو دنوں کے۔ قرآن نے أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ (گنتی کے دن) اس لئے کہا ہے تاکہ مریض شفایاب ہونے کے بعد اور مسافر اپنے سفر سے واپسی پر یہ گنتی پوری کر لے۔ اسی لئے فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ اور وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جمع قلت بالعموم تین سے نو تک کے لئے آتی ہے۔ لیکن جب قرآن نے فَلْيَصُمْهُ کہہ دیا تو پھر "ایاماً معدودات" کے معنی اسی کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔

عربی صرف و نحو کے متعلق اس اہم حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ قواعد نزول قرآن سے پہلے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اس کے کافی عرصہ کے بعد سے مدوّن کیا گیا تھا۔ ہمارے نحویوں کو چاہیے تھا کہ وہ ان قواعد کی تدوین کے لئے قرآن کو مرکز اور محور قرار دیتے۔ اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر عربی مبین کی صحیح کتاب اور کون سی ہو سکتی تھی! لیکن انھوں نے یہ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مقامات ایسے ہیں۔ جن میں ان کے وضع کردہ قواعد اور قرآن میں مطابقت نہیں۔ اب قرآن کے ان مقامات کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ یعنی صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ نحویوں کے یہ قواعد اصل بنیاد قرار پا گئے ہیں۔ جن کے تابع قرآن کو چلایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ یہ قواعد قرآن کے تابع چلتے۔ لہٰذا ہمیں قرآنی آیات کے صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے خود قرآن کو دیکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن کی آیات کو نحویوں کے ان قاعدوں کی زنجیروں سے باندھ دیں جو قرآن سے کہیں بعد مرتب ہوئے تھے۔

اب رہا "یسر اور عسر" کا سوال تو قرآن نے کہیں یہ کلیہ بیان نہیں کیا کہ "الدین یسر"۔ قرآن نے روزوں کے احکام میں مسافر، مریض اور معذور کے لئے آسانیاں بہم پہنچاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲:۱۸۵)۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی نظام میں یسر اور عسر کا فیصلہ افراد پر چھوڑ دیا جائے یعنی انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے یسر سمجھیں اسے اختیار کریں اور جسے عسر سمجھیں اسے چھوڑ دیں تو زندگی کے نظام میں یکسر انارکی پھیل جائے۔

باقی رہا آپ کا یہ کہنا کہ کئی لوگ اس روزے کی طفیل طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور کئی تو جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ تو ان کے لئے قرآن نے پہلے سے گنجائش رکھی ہے یعنی وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کہ جو لوگ روزے کی مشقت برداشت نہ کر سکیں۔ ان کے لئے فدیہ ہے۔

روزوں کے ساتھ ہی نماز کے متعلق بھی آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ہمارے سامنے دین کا نظام موجود نہیں۔ اس لئے لوگوں کو یہ چیزیں بے کار سی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر دین کا نظام سامنے ہو تو پھر یہ حقیقت خود بخود سمجھ میں آجائے کہ اس عظیم پروگرام میں ان ارکان کا کیا مقام ہے اور یہ کس قدر تابناک اور حیات بخش نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ حقیقت بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لباس فرائض کی سرانجام دہی میں حائل ہو۔ وہ پھاڑ کر پھینک دینے کے قابل ہوتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک سپاہی حسب الضرورت بلا تامل زمین پر لیٹ جاتا ہے اور کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے کپڑے مٹی میں لت پت ہو جائیں گے۔ آپ تو صرف کپڑوں ہی کا کہتے ہیں۔ ایک مومن تو قدم قدم پر اس کا اعلان کرتا ہے کہ محیای ومماتی للہ۔ میرا مرنا اور میرا جینا سب کچھ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ جو خدا نے میرے لئے تجویز کیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے یہ باتیں نکھر کر سامنے اس وقت آسکتی ہیں۔ جب دین ایک نظام کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہو۔

پرویز صاحب سے ایک سوال

محترم محمد عبداللہ صاحب شاہ پور صدر سے پرویز صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ

"آپ چونکہ حدیث شریف کے قائل نہیں ہیں محض قرآن مجید کو حسبنا کتاب اللہ کہہ کر قابل عمل و کافی سمجھتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں بار بار اقیموا الصلوٰۃ ہے، آپ مجھے از روئے قرآن ترکیب نماز سے مطلع فرمائیں۔ حدیث و رجال و طریق امت سے بالاتر رہ کر قرآن مجید سے دلیل نقلی پیش فرمائیں۔ اور آپ بھی سنا ہے بہت نیک اور نمازی ہیں، آپ کیسے نماز پڑھتے ہیں۔ اور کیوں اس طرح پڑھتے ہیں؟"

طلوع اسلام | آپ کی یہ اطلاع درست نہیں کہ میں حدیث کا قائل نہیں۔ میں قرآن اور حدیث دونوں کو ان کے اپنے اپنے مقام پر مانتا ہوں۔

(۲) آپ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ میں دین کی جزئیات تک کے لئے بھی قرآن کو کافی سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم بالعموم دین کے اصول عطا کرتا ہے جو ہر طرح سے مکمل اور ناقابل تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہیں۔ یہی مفہوم حسبنا کتاب اللہ کا ہے۔ لہٰذا نماز کی جزئیات اور ترکیب تمام و کمال قرآن کے اندر نہیں۔ انھیں رسول اللہ نے مرتب فرمایا تھا۔ بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہو گیا۔

(۳) میں اس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ جس طرح جمہور مسلمان پڑھتے ہیں۔ اس میں نہ میں اور نہ کوئی اور فرد کسی قسم کے رد و بدل کا مجاز ہے۔ (پرویز)

(طلوع اسلام اس بارے میں اپنا مسلک کئی بار واضح کر چکا ہے۔ اور ہم بار بار اس کی وضاحت اس لئے کرتے ہیں کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ ہم نہ خود مغالطے میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی کو مغالطے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہفتہ وار ہونے کے بعد بھی وضاحت

(باقی ص ۱۲ پر)

مجلس اقبال

اسرار خودی

تمہید

گذشتہ مجالس میں علامہ اقبالؒ کی اختراع واختیار کردہ اصطلاح "خودی" اور اس کے فلسفہ کے تعارف کے سلسلہ میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے، کہ ہمارا خیال ہے کہ اب اس اصطلاح اور اس کے تضمنات کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ لہٰذا اب ہم اصل کتاب کی طرف آتے ہیں۔

جب "اسرار خودی" سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تو اس کے شروع میں ایک مقدمہ (نثر میں) اور سید علی امام مرحوم کے نام پیش کش (نظم میں) تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں انہیں حذف کر دیا گیا۔ جو ایڈیشن اس وقت ہمارے پیش نظر ہے (یعنی اشاعت چہارم) اس کا آغاز رومیؒ کے ان تین اشعار سے ہوتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

یہ آرزو (یعنی انسان کی تلاش) خود فکر وکاوش اقبالؒ کا نقطۂ پرکار ہے اور وہ تو یہاں تک بھی کہہ گئے ہیں کہ

خدا ہم در تلاش آدمے ہست

لیکن یہ "آدم" جس کی ان سب کو تلاش ہے، ہنوز آب و گل میں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں،

یکے اینجسنی آدم نگر، از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

یعنی

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے

لہٰذا جس "آدم" کے متعلق رومیؒ نے کہا کہ "یافت می نشود" (وہ نہیں ملتا) اقبالؒ کو اس آدم کے ملنے کا امکان ہی نہیں، یقین بھی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف انہوں نے پیام مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا کہ

فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "زمانے کے تقاضے" اب اس طرح دنیا کو کشاں کشاں، قرآنی حقائق سے قریب تر لاتے جا رہے ہیں کہ کچھ بعید نہیں کہ وہ معاشرہ جسے ابن آدم کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سازگار بننا ہے، مستقبل قریب ہی میں وجود میں آجائے اور (قرآن کے الفاظ میں) "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔"

رومیؒ کے ان اشعار کے بعد اسرار خودی کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس تمہید کے سر عنوان نظیریؒ کا یہ شعر درج ہے:

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

قرآن کی رو سے، کائنات میں نہ تو کوئی شے باطل ہے اور نہ ہی شر۔ اشیائے کائنات کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ ان کا استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر کائناتی قوتیں یا اسباب وذرائع پیداوار، فرد کے استحکام خودی، یا نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے استعمال کی جائیں تو یہ خیر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ان کا نتیجہ ضعف خودی، یا ابن آدم کی سامان پرورش سے محرومی ہو جائے تو یہی شر بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اشیاء (قوائے کائنات کو وہ خام مسالہ) سمجھنا چاہیئے جسے ہم اپنے پیش نظر پروگرام کی تکمیل کے لئے جس طرح جی چاہے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہی صورت افراد کی بھی ہے۔ جس انسان میں جس قسم کی صلاحیت کی فراوانی ہے، اُسے اپنی صلاحیت کو اس قسم کے کام میں صرف کرنا چاہیئے۔ بس مقصد پیش نظر یہ ہے کہ وہ صلاحیت اس کی اپنی ذات کی پختگی اور نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کا موجب بنے اور اس طرح کائنات کے حسن میں تعمیری اضافے کرتی چلی جائے۔ یہی وہ تلقین ہے جو اقبالؒ نوجوانان ملت کو کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا — خیز و بر داغ دل لالہ چکیدن آموز
اگرت خار گل تازہ رسے ساختہ اند — پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابان تو برکند ترا — صفت سبزہ دگر بار دمیدن آموز

دنیائے مذاہب وتصوف میں دیکھئے۔ ان کا ضابطۂ اخلاق انسان میں صرف ایک خاص قسم کی صفات اجاگر کرتا اور اسے ایک خاص ٹائپ کا انسان بناتا ہے ــــ عاجزی بے کسی، بے چارگی، نرمی، انکساری، پیار اور محبت کا مجسمہ ــــ جو صفات ان کے خلاف ہوتی ہیں، وہ انہیں دباتا اور فنا کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا تصور اس باب میں ان سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کا خدا متضاد صفات کا حامل ہے۔ جہاں وہ رؤف رحیم ہے، وہاں وہ جبار و قہار بھی ہے۔ لیکن اس کی یہ تمام صفات اس حسن تناسب وتوازن کے ساتھ یکجا جمع ہیں کہ ان کا ظہور ہمیشہ خیر کے لئے ہوتا ہے۔ تضاد میں اس قسم کا کامل توافق، یہ ہے مفہوم اسماء الحسنیٰ کا۔ مرد مومن اپنے اندر انہی صفات خداوندی کو (علی قدر بشریت) اجاگر کرتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ صرف کسی خاص ٹائپ کی صفات کا حامل نہیں ہوتا بلکہ ان تمام متضاد صفات کا مجموعی پیکر ہوتا ہے۔ اگر ان صفات میں حسن تناسب نہ رہے تو اس کا نتیجہ شر اور فساد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان میں پورا پورا اعتدال و تناسب ہے تو یہ کائنات میں خیر اور صلح کا مظہر بن جاتی ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ کس مقام پر کس قسم کی صفت کا ظہور ہونا چاہیئے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کی راہ نمائی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار۔ رحماء بینہم۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

یہ وجہ ہے کہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی کی تمہید کے سر عنوان نظیریؒ کا یہ شعر لکھا ہے کہ

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اسلام میں منبر اور دار دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور اپنی اپنی ضرورت ومصلحت۔ منبر بغیر دار کے محض "وعظ" بن کر رہ جاتا ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اور دار بغیر منبر کے خالص استبداد و بربریت۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

منبر اور دار دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند

اس کے بعد اسرار خودی کی اصل تمہید شروع ہوتی ہے۔

فردوس گمگشتہ
از پرویز
ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔
خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۲۱۶ صفحات قیمت چھ روپے۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں جزیرۂ عرب اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ دینی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات اور جزیرہ میں نصرانیت کے فروغ سے بحث کی گئی ہے۔ آج کی صحبت میں عربوں کی طبیعت عقلیہ سے بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں علمائے عمرانیات اور دیگر محققین کی آراء پیش کی گئی ہیں یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ عقلی اعتبار سے عربوں کا کیا مقام تھا، اور ان کی خصوصیات اور امتیازات کیا تھے۔

وہ تمام باتیں جو عرب لوگ دوسروں سے نقل کرتے تھے صحیح طور پر ہو بہو نقل نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر ان میں تبدیلیاں واقع ہو جاتی تھیں جیسا کہ عربوں کی ان بعض ضرب الامثال میں ہمیں نظر آتا ہے۔ جو امثال سلیمان[1] سے منتقل ہوئی ہیں۔ نیز ان قصوں میں دکھائی دیتا ہے جو ایران اور روم سے نقل کئے گئے ہیں۔ عرب لوگ اپنے پڑوسیوں سے اس طرح منظم علم کے طور پر کچھ حاصل نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم لوگ آجکل یورپین تہذیب سے حاصل کرتے ہیں کیونکہ وہاں اس قسم کے موانع موجود تھے جو انہیں اس سے باز رکھتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو طبعی موانع تھے جو عربوں اور دیگر اقوام میں حائل تھے۔ مثلاً سمندر، پہاڑ، صحرا اور کچھ وہ بڑا بُعد جو عربوں، ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ہیئت اجتماعیہ اور درجہ عقلیہ کے اعتبار سے موجود تھا۔ کیونکہ اکثر مدنیت اور تہذیب کا حصول اسی وقت بسہولت ہو سکتا ہے۔ جبکہ دونوں عقلیتیں قریب قریب ہوں۔ نیز عربوں کی اس زمانہ کی جہالت بھی مانع آتی تھی، جب کہ ان میں کوئی لکھا پڑھا آدمی شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ جو لوگ ایرانیوں اور رومیوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ وہ ان کی دینی حکمت و موعظت کی باتیں اور قصے کہانیاں یا تاریخی حوادث نقل کرتے تھے جو بآسانی انہیں یاد رہ سکتے تھے اور جنہیں ایک بدوی آدمی یا بدوی تمدن آدمی ہضم کر سکتا تھا۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ عربوں اور ان غیر عربی قوموں میں ایسے تعلقات موجود تھے۔ جو عربوں کی مادی اور ادبی زندگی پر اثر انداز تھے۔ اور اسی امر کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

تیسری فصل

عربوں کی طبیعت عقلیہ

قومیں عقلی اور نفسی اعتبار سے بہت مختلف ہوتی ہیں ایک انگریز کی عقلیت ایک فرانسیسی کی عقلیت سے مختلف ہوتی ہے اور ان دونوں کی عقلیت ایک مصری کی عقلیت سے متفاوت ہوتی ہے وقس علیٰ ہذا۔ یہ نفسیتیں اور عقلیتیں دراصل خانگی اور اجتماعی حالات کے ماتحت متشکل ہوتی ہیں جو ہر قوم کو محیط ہوتی ہیں۔ دنیا میں قومیں مختلف درجات پر فائز ہوتی ہیں، جو مسلسل اوپر کو بڑھتے جاتے ہیں اور ہر درجہ کے اپنے عقلی اور نفسی ممیزات ہوا کرتے ہیں۔

ایک قوم کے افراد اگرچہ اپنے مدارک عقلیہ، تربیت اور تعلیم وغیرہ کے لحاظ سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، تاہم ان سب میں ایک مشترک وحدت موجود ہوتی ہے۔ اس مشترک وحدت کا ادراک تم جسمانی ساخت میں کر سکتے ہو، چنانچہ تھوڑی سی مشق کے بعد تم یہ حکم لگا سکتے ہو کہ فلاں آدمی انگریز ہے۔ فلاں فرانسیسی ہے اور فلاں مصری ہے۔ اسی طرح ایک قوم کے افراد میں ایک عقلی وحدت بھی ہوا کرتی ہے۔ جو بالکلیہ وحدت جسمیہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ عربوں کی یہ عقلی اور نفسی وحدت کیا تھی؟ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اگر ہم نمونہ کے طور پر ایک عربی شخص کو منتخب کریں جو عربوں کی نفسیات کا نمائندہ ہو سکے۔ تو اس کی صفات کیا ہونگی؟

اس موضوع پر محققین کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ہم ان آراء میں سے چند آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ عربوں کے متعلق بعض علمائے عمرانیات کا خیال ہے۔ کہ عجمی اقوام میں تو ان کے ہر حصۂ زمین میں بادشاہ ہوتے تھے، جو ان کی حفاظت کرتے تھے۔ شہر ہوتے تھے جہاں وہ مل جل کر رہتے تھے۔ احکام و قوانین ہوتے تھے جن کی وہ پابندی کرتے تھے۔ فلسفہ اور علم و فن ہوتا تھا جسے وہ پیدا کرتے تھے۔ صنعتیں حرفتیں ہوتی تھیں جنہیں وہ بناتے تھے مثلاً دیباج کی صنعت، شطرنج کا کھیل، پولو کی گیند اور مثلاً رومی فلسفہ کی تخلیق، قانون اور اصطرلاب وغیرہ لیکن عربوں میں نہ کوئی بادشاہ تھا۔ جو ان کے عوام کو مجتمع رکھ سکتا۔ دور دراز کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا سکتا۔ ظالموں کو قلع قمع کر سکتا، بیوقوفوں کو حماقت سے روک سکتا۔ نہ ہی ان کی کوئی صنعتی پیداوار تھی۔ اور نہ ہی فلسفہ اور علم و فن سے ان کو کوئی لگاؤ تھا۔ لے دے کے ان کی علمی اور فنی تخلیق ان کے وہ اشعار تھے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اس فن میں عجمی لوگ بھی ان سے فروتر نہیں تھے، چنانچہ رومیوں کے بھی عجیب و غریب اشعار پائے جاتے ہیں جو عروض اور وزن کے اعتبار سے صحیح کہے جا سکتے ہیں[1]۔

۲۔ جاحظ ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے اور عربوں اور غیر عربوں میں مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اہل ہند کے ہاں مدون مضامین اور مجلد کتابیں موجود تھیں۔ مگر ان کو کسی ایک آدمی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی ایک عالم کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ کتابیں ان میں وراثتاً چلی آرہی ہیں ان کی نوعیت اس قسم کے علوم و آداب کی ہے جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یونانیوں کے ہاں فلسفہ اور منطق ملتی ہے۔ لیکن ان کے ہاں خود منطق والا گونگا ہے، جیسے خود بیان و خطابت کا سلیقہ کبھی نہیں آیا یا ایرانیوں میں خطیب ملتے ہیں، لیکن ایرانیوں کی ہر بات اور ان کا ہر مضمون طویل غور و فکر، کوشش و خلوت کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس عربوں کے ہاں جو چیز بھی ملتی ہے۔ وہ بدیہہ گوئی اور ارتجال کا نمونہ ہوتی تھی۔ گویا کہ وہ الہام ہوتا تھا۔ جہاں نہ مشقت کشی ہوتی تھی اور نہ محنت گزینی۔ نہ فکر کو حرکت دینا پڑتی تھی اور نہ کسی چیز سے مدد لی جاتی تھی، جوں ہی انہوں نے اپنی توجہ دی۔ مضامین فوج در فوج آسمان سے اترنے لگتے" اور الفاظ سانچوں میں ڈھلنا شروع ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ اُمّی تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ فطرت کے پرورد تھے، تکلف برتنا ان کو آتا ہی نہ تھا، بہترین کلام بکثرت ان کے ہاں موجود تھا۔ اور انہیں اس پر پوری قدرت حاصل تھی۔ یہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو دوسرے لوگوں کے علوم کو یاد رکھیں اور متقدمین کے کلام کی پیروی کریں۔ وہ لوگوں کے اشعار کو یاد نہیں کرتے تھے بجز ان اشعار کے جو خود ہی ان کے دلوں میں پیوست سینوں میں چھپاں اور عقول میں جاگزیں ہو کر رہ جاتے تھے، اس کے لئے نہ وہ کوئی ارادہ و تکلف برتتے تھے اور نہ ہی تلاش و جستجو کرتے تھے اور نہ حفظ کرتے تھے"[2]

۳۔ عربوں کے بارے میں ابن خلدون کی رائے۔ عربوں کے متعلق ابن خلدون کی یہ رائے ہے ان کی تاریخ میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہے تاہم انہی کے الفاظ میں ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ عربوں کی حالت اس اجتماعی اور طبیعی حالت کے مطابق ہے جس پر ہر انسان اپنے نشو و ارتقاء کے دور میں گزرتا ہے۔ اس مضمون کو وہ اپنے ان الفاظ کے ذریعہ تعبیر کرتے ہیں کہ "عرب اقوام خلقی طور پر طبیعی اور فطری طریقہ پر ہیں" نیز وہ کہتے ہیں کہ "عرب اپنی فطری وحشت و بربریت کی بنا پر جس میں وہ گرفتار چلے آتے ہیں، لوٹ مار کرنے والے لوگ ہیں۔ جو بیکار کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جن لوگوں پر انہیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے وہ انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اس طرف انہیں کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ وہ ان پر غلبہ اور تسلط حاصل کر کے کوئی گراں قدر کام انجام دے سکیں لوٹ مار کرنے کے بعد کھلے میدانوں میں جو ان کا وطن ہوتے ہیں۔ وہ بھاگ جاتے ہیں۔ البتہ وہ قبائل جو دشوار گذار پہاڑیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ اور اسطرح محفوظ پوزیشن کے مالک ہو گئے ہیں ان کی بیہودگیوں اور فسادات سے محفوظ رہتے ہیں لیکن جو لوگ میدانی زمینوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ سامانِ حفاظت کے فقدان اور حکومت کی کمزوری کی وجہ سے جب بھی ان لوگوں کی زد پر آجاتے ہیں۔ ان کی لوٹ مار کا شکار بن جاتے ہیں۔ وہ برابر ان پر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں، تا آنکہ یہ لوگ ان سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر جلد جلد حکومتوں کی تبدیلیوں اور سیاست کے بگاڑ کی وجہ سے وہ اس حد تک پہونچ جاتے ہیں کہ ان کی تہذیب اور مدنیت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے"[3]۔

اقبال پر اپنی قسم کی پہلی کتاب
اقبال و قرآن
(از پرویز)

[1] العقد الفرید ص۔۔ ج ۲ [2] البیان والتبیین ص۱۵ ج ۲ [3] ابن خلدون ص۱۲۵

سب سے پہلے اور سب سے بڑے مفسر[1]

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری

(از علامہ تمنا عمادی مدظلہ)

ابن جریر طبری وہ امام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تفسیر کی کتاب لکھی اور اس کے ساتھ ہی تاریخ کی کتاب بھی لکھی۔ ان کی تفسیر اور تاریخ سنیوں کے ہاں بڑی قدر و منزلت سے دیکھی جاتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد جس قدر تفاسیر اور تواریخ لکھی گئی ہیں ان کی عمارت امام طبری ہی کی رکھی ہوئی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ علامہ تمنا نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ امام ابن جریر طبری درحقیقت شیعہ تھے۔ اگر یہ شیعہ تھے تو آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ اہل سنت والجماعت جس تفسیر اور جس تاریخ کو اتنا معتبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے اور اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتیں کس درجہ قابل اعتماد ہو سکتی ہیں

ہمارے دور میں علامہ تمنا فن رجال میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس باب میں ان کی وسعت نگاہیں اس اس مقام تک پہنچتی ہیں جو دوسرے لوگوں کے حاشیۂ خیال تک میں بھی نہیں ہوتیں۔ اس اعتبار سے ان کے مقالات بڑے محققانہ ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ایک ایسے مفسر اور مورخ کو، جسے سنی حضرات اتنا دقیع اور ثقہ امام مانتے ہیں، شیعہ ثابت کیا جائے، تو ان حضرات کی طرف سے اس تحقیق کی مخالفت ضرور ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب امام طبری کی طرف تشیعیت کی نسبت کی جائے گی تو اس ضمن میں بہت سی باتیں شیعہ حضرات کے متعلق بھی سامنے آجائیں گی۔ جیسا کہ اس سے پہلے متعدد بار کہا جا چکا ہے۔ طلوع اسلام نہ سنی ہے نہ شیعہ۔ اس کی نسبت کسی فرقہ سے بھی نہیں۔ اس لئے اس میں جو کچھ شائع ہوتا ہے اس سے نہ کسی فرقہ کی تائید مقصود ہوتی ہے نہ کسی کی تردید۔ اس میں اس قسم کے مضامین محض تحقیق کی غرض سے شائع ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت خالص علمی ہوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین زیر نظر مقالہ کو بھی اسی نگاہ سے دیکھیں گے اور اسے سنی یا شیعہ فرقوں میں سے کسی کی تائید یا تردید پر محمول نہیں کریں گے۔

یہ مضمون متعدد اقساط میں مکمل ہوگا۔ (طلوع اسلام)

رجال و تاریخ والے لکھتے ہیں کہ "ابوجعفر محمد بن جریر الطبری" ایک ہی زمانہ میں دو تھے، اور دونوں بڑے عالم، بڑے فاضل، بڑے ادیب، اور صاحب تصانیف تھے۔ مگر ان میں ایک تو کٹر رافضی تھے اور دوسرے ہلکے پھلکے شیعے تھے۔ دونوں کا نام ایک، ولدیت ایک، کنیت ایک، وطن ایک، اور زمانہ ایک، پھر مشرب بھی تقریباً ایک ہی۔ فرق پیدا کیا گیا ہے تو صرف دادا کے نام کا۔ یعنی صاحب تفسیر و تاریخ جو حضرت ہلکے پھلکے شیعے تھے ان کے دادا کا نام "یزید" تھا اور دوسرے جو کٹر رافضی تھے ان کے دادا کا نام "رستم" تھا۔

شیعہ حضرات کی کتاب رجال میں "ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری" کا ذکر کافی شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر ہے اور "ابن جریر بن یزید" کا ذکر مختصر طور سے کر کے لکھ دیا ہے کہ کان عامیّ المذھب یعنی یہ اہل سنت تھے، شیعہ حضرات اپنی کتابوں میں اہل سنت کو عامہ یعنی عوام لکھتے ہیں، اور سنی کو "عامیّ المذھب" یعنی عوام کا مذہب رکھنے والا۔ اور اہل سنت کی کتب رجال میں "ابن جریر بن یزید" کا ترجمہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد تمیز کے لئے "ابن جریر بن رستم" کا بھی کچھ ذکر کر دیتے ہیں۔ اور لکھ دیتے ہیں کہ یہ غالی رافضی تھے۔

امام ذہبی، میزان الاعتدال میں اور علامہ ابن حجر العسقلانی، لسان المیزان میں ابن جریر بن یزید صاحب تفسیر و تاریخ کے متعلق اس کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ فیہ تشیّعٌ یعنی ان میں شیعیت تھا مگر ان کے تشیّع کو ہلکا کرنے کے لئے حد سے زیادہ کوشش کرتے ہیں، چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں "فیہ تشیّعٌ" کے بعد ہی "وموالاۃ لا تضرّ" یعنی ان میں تشیّع تھا۔ اور حضرت علی اور ان کے اہل بیت کے ساتھ کچھ غیر معمولی موالات تھی جو ضرر رساں نہیں ہو سکتی۔

ابن حجر عسقلانی لسان المیزان میں امام ذہبی کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں، مگر "فیہ تشیّعٌ" کے بعد اپنی طرف سے "یسیرٌ" کا لفظ بڑھا دیتے ہیں۔ یعنی ان میں تشیّع تو تھا مگر ہلکا پھلکا۔

امام ذہبی نے امام سلیمانی علامہ حافظ احمد بن علی پر الزام دیا ہے کہ انھوں نے بڑا ظلم یہ کر دیا کہ ابن جریر بن یزید کے متعلق لکھ دیا کہ کان یضعُ للروافض یعنی یہ رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن جریر تو کبار ائمہ اسلام میں سے تھے۔ سلیمانی نے محض ان پر اتہام کیا ہے اور بڑا غضب کیا ہے، پھر خود ہی امام ذہبی لکھتے ہیں کہ علما کا کلام جو بعض کا بعض کے متعلق ہو اس میں توقف کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ لوگ برابر کے تھے ان میں باہم چشمکیں بھی رہتی تھیں، اس لئے اگر ایک دوسرے کے متعلق کچھ کہا جائے۔ تو دوسروں کو ان کے آپس کی باتوں سے متاثر نہ ہونا چاہیئے۔

پھر امام ذہبی[2] یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاید علامہ سلیمانی نے ایسا جملہ دوسرے ابن جریر یعنی ابن رستم کے متعلق کہا ہو۔

حافظ ابن حجر امام ذہبی کی پوری عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "اگر میں قسم کھالوں کہ علامہ سلیمانی نے جو الزام ابن جریر پر لگایا ہے اس سے ان کی مراد وہی ابن جریر بن رستم رافضی ہے وہ ابن جریر بن یزید مفسر نہیں، تو میں اپنی قسم میں نیک کار یعنی سچا رہوں گا (اس کو کہتے ہیں عقیدتمندی یہ ہے جذبۂ روایت پرستی کا غلو!!) کیونکہ علامہ سلیمانی حافظ حدیث ہیں۔ متقی ہیں۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کے دماغ سے کون سی بات نکل رہی ہے اس لئے میں ہرگز یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا کہ انھوں نے ایسے امام پر ایسا باطل حملہ کیا ہوگا۔ اتنا لکھ کر فوراً ہی ابن حجر لکھتے ہیں واللہ اعلم۔ (اس "واللہ اعلم" سے ہر فریق اپنے موافق پہلو نکال سکتا ہے)

پھر ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ الشیوخ ابوحیان کو بھی علامہ سلیمانی کے قول نے دھوکا دیا۔ کہ انھوں نے اپنی تفسیر کے اوائل میں لفظ صراط پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قال ابوجعفر الطبری وھو امام من ائمۃ الامامیۃ الصراط بالصاد لغۃ قریش الخ یعنی ابوجعفر طبری جو فرقہ امامیہ میں سے ایک امام ہیں۔ ان کا قول ہے کہ صراط صاد سے قریش کی زبان ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری کو اشتراک نے نقصان پہنچایا۔ نام کا اشتراک، کنیت کا اشتراک، باپ کے نام کا اشتراک، نسبت کا اشتراک، اور پھر معاصرت، اور ان سب پر کثرت تصانیف۔ اتنا لکھ کر پھر ابن حجر لکھتے ہیں والعلم عند اللہ ربہ والعلم عند اللہ پہلے "واللہ اعلم" کی طرح دو پہلو نہیں ہے بلکہ یہ "واللہ اعلم" اور "والعلم عند اللہ" دونوں جملے غمازی کر رہے ہیں کہ خود ابن حجر کے دل میں بھی کچھ کھٹک تھی۔ اور ان کی فطرت سلیمہ اور مہارت فن ان کو ابن جریر طبری کی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی تھی مگر روایت پرستی کا غلو ان کو مجبور کرتا تھا کہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا لو اور علامہ سلیمانی جیسے امام فن اور اپنے شیخ الشیوخ ابوحیان کی شہادتوں کی طرف کان نہ دو۔ اور ابن جریر کو اہل سنت ہی کہتے رہو۔ ورنہ یہ تفسیر و تاریخ کے سارے ذخیرے تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں گے)

پھر ابن حجر لکھتے ہیں وانما نُبِزَ بالتشیع لانہ صحّح حدیث غدیر خم یعنی ابن جریر مفسر پر جو شیعیت کا الزام لگا۔ وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے "غدیر خم" والی حدیث (من کنت مولاہ فعلی مولاہ) کو صحیح قرار دیا ہے (کیونکہ اگلے تمام محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع اور شیعوں کی من گھڑت ہے۔ شیعہ حضرات کے سوا کوئی فرد بھی اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ اور آج بھی محققین اس حدیث کو موضوع ہی سمجھتے ہیں مگر شیعوں اور ان کے رفیق کار صوفیوں کے پروپگنڈے نے اس حدیث موضوع کو اتنا مشہور کر دیا کہ کچھ اہل سنت بھی اس کو صحیح حدیث سمجھنے لگے اہل سنت میں تفضیلیہ فرقہ اسی قسم کی جھوٹی حدیثوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

اس کے بعد ابن حجر نے ابن جریر کے سنی ہونے کے ثبوت میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ یہ کہ واخرج ابن عساکر من طریق محمد بن علی بن سھل بن الامام۔ قال سمعت اباجعفر الطبری وذکرَ علیؓ فقال ابوجعفر من قال ان ابابکر و عمر رضی

---

[1] ابن جریر طبری سے بھی بعض متقدم مفسرین کا ذکر کتابوں میں ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض نے اسّی جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کی تھی مگر وہ تفسیریں جب دنیا کی نظروں کے سامنے صدیوں سے نہیں ہیں تو ان کا ذکر ہی فضول ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تفسیریں صحیح ہوں اس لئے ملاحدۂ عجم ہی نے ان کو ضائع کر دیا ہو۔ سب سے قدیم تفسیر ابن جریر ہی کی دنیا کے سامنے ہے۔ اس لئے یہی زیر بحث آ سکتی ہے۔

[2] امام ذہبی کی میزان الاعتدال اور حافظ ابن حجر کی لسان المیزان انھیں راویانِ احادیث و تفسیر کے حالات میں ہیں جو کم و بیش مجروح ہیں اور ائمہ حدیث نے جن کی حدیثیں کم قبول کی ہیں یا جن کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ میزان الاعتدال میں تو صحاح کے راوی بھی کچھ ہیں مگر لسان المیزان میں صحاح کے راوی ایک بھی نہیں۔ ابن جریر سے صحاح میں کوئی روایت بھی نہیں ملی ہے اور کیوں؟ متاخرین ان کی حمایت

اللہ عنہما) لیسا بامامی ھدًی الیش ھو؟ فقال لہ الطبری منکرًا علیہ مبتدع، مبتدع ھذا؟ یُقتَلُ من قال ان ابا بکر وعمر لیسا بامامی ھدًی یُقتَلُ یُقتَلُ۔ یعنی ابن عساکر بطریق محمد بن علی بن سہل بن الامام روایت کرتے ہیں کہ ابن الامام نے کہا کہ میں نے ابوجعفر طبری کو کہتے ہوئے سنا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ ابوجعفر نے کہا کہ جو شخص یہ کہے کہ ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) ہدایت کے امام نہ تھے، وہ کیا ہے؟ ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے تو ابن الامام کی بات کا انکار کرتے ہوئے ابوجعفر نے کہا کہ وہ بدعتی ہے، بدعتی ہے؟ قتل کیا جائیگا جس نے کہا کہ ابوبکر وعمر ہدایت کے امام نہ تھے قتل کیا جائے گا۔ قتل کیا جائیگا۔

سب سے پہلے تو یہی معلوم کرنا ہے کہ ابن عساکر جن کی ولادت ۴۹۹ھ میں اور وفات ۵۷۱ھ میں ہوئی۔ اور ابن الامام کی ولادت ۲۸۱ھ میں اور وفات ۳۵۷ھ میں ہوئی۔ تو ابن الامام کی وفات کے ایک سو بیالیس برس کے بعد ابن عساکر پیدا ہوئے تھے، اس لئے جب تک ابن عساکر اور ابن الامام کے درمیان کا راوی معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟

مگر میرے خیال میں یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس عبارت ہی میں شیعیت کی پوری شان نمایاں ہے۔ شیعہ حضرات کا یہ دستور ہے کہ اپنے اصول تقیہ وکتمان کے ماتحت اکثر دو پہلو باتیں ضرورت کے وقت کرتے ہیں۔ اور ایسی باتیں غالباً وہ پہلے سے سوچے ہوئے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑی تو یوں بولیں گے جس کی متعدد مثالیں شیعہ علماء ومصنفین کے اقوال میں ملتی ہیں۔ چنانچہ اسی عبارت کے وقف ووصل کو ذرا بدل کر یوں پڑھیئے کہ فقال ابو جعفر من قال ان ابا بکر وعمر لیسا بامامی ھدًی الیش ھو؟ فقال لہ ابن الامام مبتدع۔ فقال لہ الطبری منکرًا علیہ مبتدع مبتدع ھذا؟ یُقتَلُ من قال۔ ان ابا بکر وعمر لیسا بامامی ھدًی یُقتَلُ یُقتَلُ۔ اب اس عبارت کا ترجمہ یوں ہوا کہ ابن جریر سے ابوجعفر نے پوچھا کہ جو شخص یہ کہے کہ ابوبکر وعمر ہدایت کے امام نہیں ہیں۔ وہ کیا ہے؟ (یعنی اگر کسی نے ایسا کہا تو اس پر کیا الزام ہے؟) ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے تو ابن الامام سے طبری نے کہا ان کی بات کا انکار کرتے ہوئے کہ وہ بدعتی ہے! وہ بدعتی ہے! قتل کیا جائے گا جو ایسا کہے گا۔ (یعنی جو اس کو بدعتی کہے گا وہ قتل کیا جائیگا) بے شک ابوبکر وعمر ہدایت کے امام نہ تھے۔ قتل کیا جائیگا، قتل کیا جائیگا (یعنی وہ جس نے ان دونوں کے امام ہدایت ہونے سے انکار کرنے والے کو بدعتی کہا)

میں نے بریکٹ میں جو مفہوم کو واضح کرنے کے لئے عبارت بڑھائی ہے۔ وہ صرف سمجھانے کے لئے ایسا نہ ہو کہ عام ناظرین یہ سمجھیں کہ پہلے ترجمہ میں اس طرح کے بریکٹ نہ تھے۔ اس لئے وہ ترجمہ صاف تھا، اور یہ ترجمہ زبردستی بنالیا گیا ہے۔ اس لئے اتنے بریکٹ کی ضرورت پڑی۔ جو شخص عربی جانتا ہے اور عربی اردو سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہے۔ وہ دونوں ترجموں کے مطابق عربی عبارت کو بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے اور یہ نہیں الزام دے گا کہ بریکٹ کے ذریعہ سے قائل کے مقصود کے خلاف ایک معنی اور زبردستی نکالے جا سکتے ہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ شیعہ مصنفین اپنی کتابوں میں ایسے دو پہلو الفاظ رکھا کرتے ہیں، کہ حسب موقع اس کے پہلو بدل لیے جا سکیں، تو مناسب ہے کہ اس کی دو ایک مثال بھی پیش کر دوں ملاحظہ فرمائیے۔

شیعوں کے مشہور محدث وعالم علم رجال علامہ شیخ حلی اپنی کتاب "خلاصۃ الاقوال فی معرفۃ الرجال" کے صفحہ ۱۲۱ میں محمد بن شہاب زہری کے متعلق لکھتے ہیں من اصحاب علی بن الحسین عَدَّدَہٗ یعنی لوگوں نے ان کو حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) کے اصحاب میں شمار کیا ہے مگر آپ اس کو عَدُوٌّ لَّہٗ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ تو ترجمہ یوں ہوگا کہ یہ علی بن الحسین کے اصحاب میں تھے مگر ان کے دشمن تھے۔

اہل کوفہ میں سے کسی نے حضرت علی سے حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا انھما امامان عادلان قاسطان کانا علی الحق۔ یعنی وہ دونوں عادل وانصاف ور امام تھے، حق پر تھے اور حق پر مرے، یہ پوری روایت شیعوں کی قدیم کتابوں میں موجود ہے، یہاں تک کہ "تحفۂ ہمایوں کشف نادری" ص ۲۲۵ میں بھی موجود ہے۔ مگر متاخرین شیعہ حضرات نے صرف آدھی بات اپنی کتابوں میں لکھی یعنی انھما امامان عادلان قاسطان ہی تک۔ اور عادل کا ترجمہ کیا "حق سے عدول یعنی انحراف کرنے والا" اور قاسط کا ترجمہ کیا "ظالم" کیونکہ "عادل" جس طرح "عدل" کا اسم فاعل ہے اسی طرح "عدول" کا بھی اور "قسط" لغاتِ اضداد سے ہے۔ اس کے معنی انصاف کے بھی اور ظلم کے بھی۔ حالانکہ "عدل وقسط" جب ساتھ آئیں گے تو ان سے "عدل وانصاف" کے ہی معنی لئے جائیں گے۔ کبھی انحراف وروگردانی وظلم کے معنی نہیں لئے جا سکتے۔ مگر اسی معنوی تحریف کے لئے تو پوری روایت نقل نہیں کرتے۔ آدھی بات لکھتے ہیں۔

(بالکل یہی حال فرقہ شیعہ کا ہے) تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول میں شیعہ حضرات اہل سنت کے ساتھ گھل مل کر رہے اور ہمیشہ تقیہ وکتمان کی نقاب اپنے چہروں پر ڈالے رہے۔ کبھی کبھی فضیلت شیخین کا راگ بھی بآواز دہل الاپتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض نے حضرت علیؓ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخیاں علانیہ طور سے کر کے اپنے آپ کو خارجی بھی مشہور کر لیا مگر تھے وہ درحقیقت شیعہ۔ اسی لئے روایتیں ہمیشہ شیعوں کے موافق بیان کرتے رہے۔ تاکہ عوام اور ناواقف یا سادہ لوح محدثین یہ سمجھیں کہ ایک خارجی ہو کر جب یہ ایسا کہہ رہا ہے۔ تو ضرور یہ روایت سچی ہوگی۔

آپ شیعہ حضرات کی کتب احادیث کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایک مستقل باب، باب الکتمان، آپ کو ملیگا جس میں ان کے ائمہ کی تاکیدی تصریحات موجود ہیں کہ ہر شیعہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے دین اپنے عقیدہ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھے۔ چنانچہ اصول کافی میں یہ حدیثیں موجود ہیں کہ لَا تَبُثُّوا سِرَّنَا وَلَا تُذِیعُوا اَمْرَنَا۔ یعنی ہمارا راز فاش نہ کرو اور ہمارا دین شائع نہ کرو۔ اِنَّکُمْ عَلٰی دِیْنٍ مَنْ کَتَمَہٗ اَعَزَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ اَذَاعَہٗ اَذَلَّہُ اللّٰہُ۔ تم لوگ ایسے دین پر ہو کہ جس نے اس دین کو پوشیدہ رکھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو عزت دے گا۔ اور جو شائع کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے گا۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ ایسے لغو اقوال جو خلاف قرآن ہیں کبھی حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما یا ان کے ابناء واحفاد رضی اللہ عنہم کے نہیں ہو سکتے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ حضرات ان احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں بہرحال جب تک ان کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس وقت تک علمائے اہل سنت پر ان کا صحیح عقیدہ کبھی واضح نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ابان بن تغلب جیسے غالی شیعہ کے متعلق جس کے متشدد شیعہ ہونے کی شہادت خود شیعوں کی کتب رجال سے مل رہی ہے۔ امام ذہبی میزان الاعتدال میں کان غالیا فی التشیع اور ذائغ مجاھر لکھنے کے بعد بھی وثقہ احمد بن حنبل وابن معین وابو حاتم لکھتے ہیں اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مبتدع کی توثیق کیونکر جائز ہو سکتی ہے تو پھر اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو بدعت صغریٰ جیسے غلو فی التشیع یا تشیع بلا غلو وبلا تحرق تو یہ اکثر تابعین میں تھا اور تبع تابعین[1] میں باوجود ان کے دین وورع اور صدق کے تو اگر ان سب لوگوں کی حدیثیں رد کر دی جائیں، تو سارے آثار نبویہ[2] جاتے رہیں گے، اور یہ مفسدۂ عظیم ہے۔ اور دوسری بدعت کبریٰ ہے مثل رفض کامل اور غلو فی الرفض کے اور حضرات شیخینؓ پر حملے، اور اس مسلک کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔ تو ایسی بدعت کبریٰ والوں کی سند نہیں لی جائے گی بلکہ ان میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔۔۔۔ پھر آگے چل کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا سچا آدمی اس جماعت کا نہیں ہے جو کذب سے محفوظ ہو۔ بلکہ کذب ان کا شعار اور تقیہ ونفاق ان کا دثار ہے۔ تو جس کا یہ حال ہو اس کا قول کیونکر قبول کیا جائے گا۔ مگر زمانہ سلف میں شیعہ غالی وہ تھا جو حضرات عثمان وطلحہ وزبیر ومعاویہ رضی اللہ عنہم کی شان میں کچھ گفتگو رکھتا تھا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علیؓ سے محاربہ کیا ان کو کچھ برا بھلا کہتا تھا۔ مگر اس زمانہ کے شیعے تو حضرات شیخینؓ سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔ اور حضرات عثمان وطلحہ وزبیر ومعاویہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرتے ہیں غرض امام ذہبی[3] آخر میں فرماتے ہیں کہ ابان بن تغلب ایسے تھے۔ وہ شیخینؓ کی شان میں کچھ تعرض نہیں کرتے تھے۔ صرف حضرت علیؓ کو ان دونوں سے افضل ضرور سمجھتے تھے۔

حیرت ہے کہ امام ذہبی اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ اگر یہ لوگ مسلک کتمان کو اختیار نہ کرتے۔ تو ان سے حدیثیں کون لیتا اور کون ان کا اعتبار کرتا۔ اس لئے وہ اپنے مسلک کتمان کے مطابق ہمیشہ اپنے عقائد کو پوشیدہ ہی رکھتے رہے اور کبھی حضرات شیخینؓ کی شان میں کھلم کھلا بے موقعہ نہ بول سکے بلکہ اپنی بے تعصبی دکھلانے کے لئے فضیلت شیخین کی روایتیں بھی کبھی کبھی بیان کرتے رہے۔ مثلاً عبدالرحمن بن صالح اللذی العتکی، ابو صالح ویقال ابو محمد الکوفی جو کہا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے بعد افضل امت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حالانکہ محترق فی التشیع تھا۔ اور اصحاب رسول اللہ صلعم کی ہجو وتنقیص میں کتاب تصنیف کر رکھی تھی اور حضرات امہات المومنین ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو ومنقصت بیان کرتا تھا۔ مگر جن لوگوں کے سامنے ایسی ناشائستہ باتیں بیان کرتا تھا، اور جنھوں نے اس کی کتاب

---

[1] تابعین وتبع تابعین جو طبقات الحدیث تھے جو غالباً سو میں دس پانچ سے زیادہ نہ تھے اور پھر انھیں تابعین اتباع تابعین کے زمرے میں منافقین عجم بھی تو تھے اسلئے صرف تابعی ہونے کی وجہ سے کسی کو تابعی ثقہ لکھ دینا اور سمجھ لینا تو درحقیقت اصل مروی عنہ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرنا ہے [illegible] آخری زمانہ میں کس طرح باندھا گیا۔

[2] آثار نبویہ ان سے حاصل نہ ہوتے مگر البتہ ان کی روایتوں کے ذریعہ تمام صحیح آثار نبویہ برباد ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کا ہمی [illegible]

[3] یہ امام ذہبی کا تجربہ [illegible] اپنے زمانہ کے شیعوں کا حال تحریر فرما رہے ہیں۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا [illegible]

ہجو ومنقصت دیکھ لی انھوں نے اس کو رجل سوء (نہایت برا آدمی کہا) اور محترق فی التشیع کہا اور اس سے جو حدیثیں لی تھیں ان سب کو جلا دیا۔ اور جن کے سامنے یہ کتمان کرتا رہا وہ اس کو نہایت ثقہ اور سچا سمجھتے رہے۔ چنانچہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہما اس کے بڑے معتقد اور مداح تھے باوجود اس کے کہ اس کو شیعہ سمجھتے اور جانتے تھے۔

یہی حال سلیمان بن مہران الاعمش اور ابو اسحاق السبیعی اور زبید الیامی اور منصور بن معتمر وغیرہم کا ہے۔ عبداللہ بن المبارک فرمایا کرتے تھے کہ افسد حدیث اھل الکوفة ابو اسحٰق والاعمش لکم ھذا، یعنی اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق نے اور تمہارے اس اعمش نے برباد کیا۔ اور قریب قریب ایسی کے معن بن عیسیٰ ابو یحییٰ القزاز المدنی نے بھی کہا کہ افسد حدیث اھل الکوفة الاعمش وابو اسحٰق ان سارے اقوال کے علاوہ تہذیب التہذیب میں یہ بھی ابن حجر نے میزان سے نقل کیا ہے کہ کان من اھل الکوفة قوم لا یحمد الناس مذاھبھم ھم رؤوس محدثی الکوفة مثل ابی اسحٰق ومنصور و زبید الیامی والاعمش وغیرھم من اقرانھم یعنی اہل کوفہ میں ایک قوم تھی جن کا مذہب لوگوں میں ناپسندیدہ تھا اور وہ محدثین کوفہ کے سرداروں میں تھے۔ مثل ابو اسحٰق اور منصور اور زبید الیامی اور اعمش کے اور ان کے سوا ان کے اقران۔ مگر باوجود ان تحریروں کے احادیث اہل سنت کے دفاتر آج انہی لوگوں کی روایتوں سے بھرے پڑے ہیں جس کی وجہ یہی ہے جس کو امام ذہبی نے لکھا کہ اگر ان لوگوں سے روایتیں نہ لیں تو پھر (بزعم الشان) آثار نبویہ کا ایک بہت بڑا حصہ جاتا رہتا ہے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب بضمن ترجمہ قتادہ بن دعامہ لکھتے ہیں کہ قال ابن المدینی یحییٰ بن سعید ان عبد الرحمٰن یقول اترک کل من کان راسا فی البدعة یدعو الیھا قال کیف تصنع بقتادة و ابن ابی رواد وعمر و بن ذر و ذکر قوما۔ ثم قال یحییٰ ان ترکت ھذا الضرب ترکت ناسا کثیرا۔ یعنی علی بن المدینی یحییٰ بن سعید سے کہنے لگے کہ عبد الرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں (یہ تینوں کبار ائمہ حدیث اور اساطین جرح و تعدیل ہیں) کہ وہ شخص جو بدعت میں سردار ہو اور دوسروں کو بدعت کی طرف دعوت دے اس کو ترک کر دو تو یحییٰ بن سعید نے کہا تو پھر قتادہ اور ابن ابی رواد اور عمرو بن ذر وغیرہم (ایک جماعت کا نام لیکر کہا) ان لوگوں کے ساتھ تم کیا کرو گے؟ پھر یحییٰ بن سعید نے کہا کہ اگر اس قسم سے ہم ترک کرنے لگیں تو ایک بڑی جماعت کو ترک کر دینا پڑے گا۔ اتنی تفصیل سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ راویان حدیث میں کثرت اہل بدعت کی تھی۔ تابعین و تبع تابعین میں سے جو راویان حدیث تھے۔ ان میں متشیعین بہت تھے اور مبتدعین بے حد۔ (اور کیوں نہ ہوتے؟ منافقین عجم کی جماعت بھی تو انھیں میں ملی جلی تھی۔ اس لئے جو سچے اور مخلص تھے۔ وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے)

اتنی تصریح سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ روایتوں کے لالچ میں آ کر شیعوں اور روافض کے تشیع و رفض کو نظر انداز کر کے ائمہ حدیث ان سے روایتیں لیا کرتے تھے اور یہ شیعی راویان حدیث شہد میں زہر گھول گھول کر رکھتے تھے۔ ہر دس پندرہ روایتوں میں سے کم سے کم ایک دو روایت ایسی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے کوئی نہ کوئی فساد ضرور پیدا ہو۔ چاہے وہ فسادات عقائد میں ہوں یا عبادات میں اخلاق میں ہوں یا معاملات میں۔ مگر چونکہ وہ زہر شہد میں ملا ہوا ہوتا تھا۔ اس لئے شہد کی ظاہری صورت دیکھ کر بھولے بھالے شہد کے خریدار اس کو لے لیا کرتے تھے۔ انھیں اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس شہد میں زہر بھی ملا ہوا ہے۔ اور بعض جان بوجھ کر تاویلی تریاق کے بھروسے پر وہ زہر آلود روایتیں بھی لے لیا کرتے تھے۔ مگر وہ زہر ان میں نہیں تو دوسروں میں اپنا کام کرتا رہا۔

بالکل اسی طرح ابن جریر طبری کی تفسیر ہے کہ تفسیری روایات جس کا زیادہ تر سرمایہ انھیں وضاعین و کذابین و ضعفاء و متروکین اور روافض صوفیہ کے مفتریات و مکذوبات ہی سے جمع ہوا ہے۔ سب کو تقریباً انھوں نے جمع کر دیا ہے اور بقول علامہ حافظ احمد بن علی السلیمانی بطور خود بھی روافض کے موافق بیسیوں روایتیں وضع کر کے اپنی تفسیر میں درج کر دی ہیں۔ مگر اتنا بڑا ذخیرہ تفسیری روایات کا جمع کرنے والا ان سے متقدم کوئی بھی نہیں گذرا۔ اگر ابن جریر کو رافضی و وضاع تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کی تفسیر سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔ اور یہ سرمایہ جس سے ہر فرقہ اپنے اپنے موافق تفسیری روایتیں لے کر اپنے اپنے فرقہ کی پشتیبانی کرتا رہتا ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ بس صرف اسی لئے امام ذہبی اور ابن حجر دونوں نے ان کو صرف شیعہ بننے دیا، وہ بھی مجبوراً چونکہ اس سے انکار نہ کر سکے۔ باقی رہا رفض تو اس سے امام ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ ابن جریر ہرگز رافضی نہ تھے۔ حالانکہ دونوں لکھتے ہیں کہ علامہ حافظ سلیمانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ابن جریر روافض کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے مگر ان کو نقل کرنے کے بعد بھی علامہ حافظ سلیمانی کے علم و فضل و اتقان کے تسلیم کرنے کے باوجود بھی اس الزام کو اتہام قرار دیتے ہیں۔ پھر ابن حجر کے شیخ الشیوخ ابو حیان اپنی تفسیر میں ان کو مذہب امامیہ کا ایک امام لکھتے ہیں اور انھوں نے کوئی حوالہ علامہ سلیمانی کا نہیں دیا ہے۔ مگر ابن حجر اپنے شیخ الشیوخ پر بھی رجما بالغیب الزام دیتے ہیں کہ ان کو علامہ سلیمانی کے قول سے دھوکا ہوا جو ایسا لکھ دیا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن جریر نے حدیث غدیر خم کی تصحیح کی۔ حالانکہ سارے ائمہ حدیث، اس کو موضوع اور من گھڑت یقین کرتے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ابن حجر نے طلاق کے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں ابن جریر نے مذہب شیعہ کے مطابق فتویٰ دیا تھا۔ اور حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ایک خاص کتاب بھی لکھی تھی۔ غرض یہ ہے کہ طرح طرح کے ثبوت ابن جریر کے رفض کے مل رہے ہیں مگر صرف ان کی تفسیر کی خاطر ان کو فقط شیعہ تک تو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر رفض سے انکار کئے جاتے ہیں۔ اس "حمیت جاہلیت" کا کیا جواب ہے؟

اگر واقعہ کے اعتبار سے ان کی تفسیر کو دیکھئے تو ہر اس مقام پر جہاں شیعوں نے اپنا مطلب نکالنا چاہا ہے ایک نہ ایک تفسیری روایت شیعوں کے مطابق ضرور موجود ہے، سورہ احزاب کی آیہ تطہیر کو دیکھ لیجئے، پورا رکوع اور اس کی ایک ایک آیت بزبان حال خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کے ہر جملے کی مورد امہات المومنین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر شیعے کہتے ہیں کہ ہاں پورا رکوع ضرور ازواج النبی صلعم کے متعلق ہے۔ اور وہ آیت جس کا آخری ٹکڑہ ہے انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ آیت بھی ازواجؓ ہی کے متعلق ہے مگر صرف اتنا ٹکڑا حضرات علیؓ و فاطمہؓ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے متعلق ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی پھر ازواج مطہرات نبیؐ کی طرف مخاطبت ہے۔ یہ قول خلاف سیاق و سباق اور خلاف عقل و درایت جس قدر ہے معمولی سی عقل و فہم والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ مگر غلو بغیر الحق کی وجہ سے ایسی خلاف عقل بات پر خواہ مخواہ کا اصرار کیا جاتا ہے۔ شیعان کوفہ نے اسی کے لئے واقعۂ کساء والی روایتیں گھڑ گھڑ کر اس کی خوب خوب اشاعت کی۔ یہاں تک کہ شیعہ حضرات کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا قابل فہم ہے لیکن غور کیجئے کہ مسند احمد وغیرہ میں بھی اس کی روایتیں نظر آنے لگیں جس کا سبب کیا ہے؟ اس موضوع پر میرا ایک مستقل مضمون تیار ہے۔ انشاء اللہ کبھی شائع ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا خلاصہ رسالہ البیان امرتسر مورخہ اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۴۶ء کے دو پرچوں میں باقساط چھپ چکا ہے۔ اس لئے بہم سردست اس بحث سے قطع نظر کرتا ہوں۔ غرض مسند احمد اور ابن ابی حاتم کی کتاب میں اس واقعہ کی چند موضوع روایتیں ملتی ہیں۔ مگر تفسیر ابن جریر میں آپ دیکھ لیجئے۔ سولہ روایتیں اس واقعہ کساء کے متعلق انھوں نے ایسی ایسی درج کی ہیں جن میں سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہی روایتیں ایسی ہونگی جو کسی اور کتاب میں بھی مذکور ہوں اور کم سے کم دس روایتیں تو یقیناً ایسی ہیں جو صرف امام ابن جریر کی خاص طبعزاد ہیں۔ ہرگز ہرگز دوسرے کے پاس نہ ملیں گی۔ اسی طرح اور دوسرے مقامات کو بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ سلیمانی کے اس قول کی صاف تصدیق ہو جاتی ہے کہ ابن جریر شیعوں یا رافضیوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

ذاتی ملکیت کے قرآنی تصور کے لئے
نظامِ ربوبیت
ملاحظہ کیجئے

۱؎ یہ روایتیں اپنے اختلاف مضامین واضطراب بیانات کی وجہ سے خود ایک دوسرے کی تردید کر رہی ہیں۔ میرا ایک مستقل رسالہ ہے "تطہیر آیۃ التطہیر من دنس صنعاء اللذات فی التفسیر" میں نے اس رسالہ میں ان تمام روایات کی پوری قلعی کھول دی ہے

سنّت کی صحیح حیثیت

محترم امین احسن صاحب اصلاحی سے آپ نے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۵۵ء

میں "مسودہ قانون و صاحب قانونِ شریعت بابت ۱۹۵۲ء" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع فرمایا ہے۔ جس میں آپ نے لکھا ہے کہ

> جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح اسلام میں کتاب اور سنت کے درمیان کسی تفریق کی گنجائش نہیں۔ سنت سے میری مراد نبی صلعم کا ثابت شدہ طریقہ ہے، اسلام میں اس سے انحراف کھلا ہوا کفر ہے۔

اس میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں یہ تو آیا ہے کہ ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ کہیں نہیں آیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس قرآن کریم میں بصراحت مذکور ہے کہ رسول خدا کا عبد ہوتا ہے اور عبد اور معبود میں فرق نہ کرنا کھلا ہوا شرک ہے۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ آپ کے پاس یہ کہنے کی کیا سند ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی؟

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ "سنت سے مراد نبیؐ کا ثابت شدہ طریقہ ہے۔"

کیا آپ فرمائیں گے کہ

(ا) ثابت شدہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟

(ب) اسے کس نے ثابت کیا ہے؟

(ج) یہ ثابت شدہ طریقہ آج یہ تمام و کمال کہاں مل سکتا ہے یعنی کس کتاب میں۔ اور اس کی سند کیا ہے کہ وہ ثابت شدہ ہے؟

چونکہ یہ دین کے بڑے اہم سوالات ہیں۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ محترم اصلاحی صاحب ان کے جواب سے ضرور سرفراز فرمائیں گے تاکہ بات صاف اور واضح ہو جائے اور گمراہیاں رک جائیں۔

محترم عبدالغفار حسن صاحب سے آپ نے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۵۵ء

میں "رسائل و مسائل" کے عنوان کے ماتحت تحریر فرمایا ہے کہ

> رسول اللہ نے وحی خفی (سنت) کے ذریعے قرآن مجید کے معانی اور مصداق کو متعین فرمایا۔

لیکن محترم مودودی صاحب، تفہیمات حصہ اول ص ۲۳۵ پر لکھتے ہیں کہ

> (اللہ نے رسول کو درمیان واسطہ اس لئے بنایا کہ) وہ اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کر دیں، جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیئے۔

یعنی آپ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے وحی خفی کے ذریعے ایسا کیا۔ اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ حضورؐ نے اپنی خداداد بصیرت کی رو سے ایسا کیا۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ ان میں سے کونسی بات صحیح ہے؟

(۳) آپ نے لکھا ہے کہ

> رسول اللہ نے قرآنی اصول و ضوابط کی روشنی میں حلال و حرام کی ایسی فہرست بھی امت کو بتائی۔ جو قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں۔

لیکن محترم مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اول) کے صفحہ ۵۹۸ پر فرماتے ہیں کہ

> حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

کیا آپ فرمائیں گے کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

(۴) آپ نے لکھا ہے کہ

> حدیث کو بطور دینی حجت ماننے سے انکار کرنے والا منکر حدیث کہلاتا ہے۔ باقی رہا جو شخص دیانتدارانہ طور پر اپنے فہم و بصیرت سے روایات کے وسیع ذخیرے میں سے کسی ایک یا چند روایات کو اس بنا پر قبول نہیں کرتا کہ وہ اصولِ روایت یا اصول درایت کے خلاف ہیں تو اسے منکر حدیث نہیں کہا جا سکتا۔

"دینی حجت" کے معنی یہ ہیں کہ کسی اختلافی معاملہ میں جب وہ سند پیش کر دی جائے تو اس کے بعد بات ختم ہو جائے اور کسی کو اس میں مجال انکار یا یارائے گفتگو نہ رہے۔ مثلاً اگر یہ سوال زیر بحث ہو کہ لحم خنزیر حلال ہے یا حرام۔ اور ایک شخص قرآن کی آیت پڑھ دے کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ... (۵/۳) تو یہ دینی حجت ہو جائے گی۔ اس میں کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ یہ کہہ دے کہ میں اپنی فہم و بصیرت کے مطابق اسے قابل قبول تسلیم نہیں کرتا۔

لیکن حدیث کے معاملہ میں آپ فرماتے ہیں کہ اس کی اجازت ہے کہ کوئی شخص یہ کہہ دے کہ میں اپنی فہم و بصیرت کے مطابق فلاں حدیث کو ناقابل قبول سمجھتا ہوں کیونکہ یہ فلاں فلاں اصول روایت و درایت کے خلاف ہے۔

فرمائیے کہ اس باب میں قرآن اور حدیث میں بنیادی فرق ہو گیا یا نہیں۔ اور ایسی چیز جس میں افراد کو رد و قبول کرنے کا اختیار حاصل ہو کسی طرح بھی دینی حجت ہو سکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جن احادیث کو اپنی فہم و بصیرت کے مطابق دیانتدارانہ طور پر قابل قبول سمجھتا ہے، وہ انہیں دینی حجت سمجھ لے۔ لیکن وہ دینی حجت صرف اس کے اپنے لئے ہو سکتی ہیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص انہیں دینی حجت نہ مانے تو اس سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوگا۔

اب فرمائیے کہ جس دینی سرمایہ کی حیثیت یہ ہو کہ اس کا کوئی ایک حصہ بعض کے نزدیک حجت ہو، اور دوسرا حصہ دوسروں کے نزدیک، اسے آپ ساری امت کے لئے متفقہ طور پر دینی حجت کس طرح قرار دیں گے؟ یعنی وہ کون سی احادیث ہونگی جن کے متعلق آپ یہ کہیں گے کہ یہ ساری کی ساری امت کے لئے دینی حجت ہیں۔ اور ایسا کہنے کے لئے آپ کے پاس کیا سند ہوگی؟

جب رسول اللہ صحابہؓ کو دین کے متعلق کوئی حکم دیتے تھے تو کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنے فہم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھے، اور چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو (معاذ اللہ) اسے رد کر دے۔ لیکن احادیث رسول اللہ کے متعلق آپ یہ حق تسلیم کرتے ہیں! اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک حجت دین ہونے کا تعلق ہے، رسول اللہ کے ان احکام میں جنہیں حضورؐ نے اپنے زمانہ میں نافذ فرمایا اور ان احکام کے مجموعہ میں جو آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں، ایک بنیادی فرق ہے۔ کیا جو شخص اس فرق کو تسلیم کرے وہ صحیح راستے پر ہے یا گمراہ ہے؟

کیا ہم توقع کریں کہ آپ دین کے ان اہم مسائل کے متعلق وضاحت فرما کر شکرگذاری کا موقعہ دیں گے؟

بزمِ طلوعِ اسلام

ہر شخص قدم قدم پر دیکھتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بد اخلاقی، بددیانتی، جھوٹ وغیرہ کا ایسا چلن ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے کام نہ لے تو وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ آئے دن کا تجربہ ہے کہ دیانتداری سے کام لینے والے ناکام ہوتے ہیں، اور جھوٹ اور بددیانتی سے کام لینے والے کامیاب ہوتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کی ان غلط بنیادوں کو بدلا نہیں جا سکتا؟ یہ سوال اکثر سوچنے والوں کو پریشان کرتا ہے۔ اور کم ایسے لوگ ہیں جو اس کے صحیح جواب تک پہونچتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اجتماعی مسئلہ کو انفرادی طریق سے سوچا جاتا ہے، اور جب اس کا حل ملتا نہیں اور ملتا ہے تو وہ ممکن العمل نظر نہیں آتا، تو یہ سوچنے والے بھی ادھر کو ہو لیتے ہیں جس طرف کی ہوا ہے۔ اس طرح رائج غلط اقدار مستحکم ہو جاتی ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ ان کا بدلنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

لیکن یہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ ہو، اور جواب بھی وہ جو سو فیصدی ممکن العمل ہو۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی صورت میں ان کا ساتھ نہ چھوڑے لیکن ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان اقدار کو حرز زندگی بنائے رکھنے میں نقصان ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں اس قدر فساد

پیدا ہو جائے۔ تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اقدار مستقل کو چھوڑ کر وقتی نقصان کا مداوا کر لیا جائے۔ بلکہ ان کو پوری مضبوطی سے تھامے ہوئے ان حالات کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے، جو اس نقصان کے باعث ہوتے ہیں۔ یہ جنگ تنہا نہیں لڑی جا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت حاصل کی جائے جو مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہیں (اور انہیں نقصان کے ڈر سے انہیں چھوڑ نہیں دیتے) تنہا افراد بے بس ہوں گے اور وہ بدستور نقصان اٹھاتے رہیں گے لیکن جب کئی ہم خیال متحد ہوتے جائیں گے۔ تو اس اتحاد و یکجہتی سے ان کی قوت بڑھ جائے گی اور وہ نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہی جماعت رفتہ رفتہ پھیلتے پھیلتے اس قابل ہو جائے گی کہ وہ معاشرے کی بنیاد مستقل اقدار پر استوار کرے۔ جب ایسا ہو گا ....

... تو پھر مستقل اقدار کے خلاف جانے والے نقصان اٹھائیں گے۔

اس نکتہ کو خاص طور پر سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک فرد اپنے دل میں کتنا ہی اطمینان اور سکون کیوں نہ پیدا کرلے وہ جنتی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ جنتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایسا فرد اسی قسم کے افراد کے زمرے میں داخل ہو جائے۔ قرآن نے نفس مطمئنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (۸۹/۲۹-۳۰) تو خدا کے بندوں کی جماعت میں داخل ہو اور اس طرح جنت میں داخل ہو۔ جنتی زندگی کے لئے خدا کی بندوں کی جماعت میں شمولیت شرط اول ہے۔ لہذا

یہ ضروری ہے کہ افراد ہم خیال افراد سے مل کر خداوندی معاشرہ کی تشکیل کی کوشش کریں۔

بزم طلوع اسلام کا مقصود و منشا یہی ہے کہ قرآنی فکر سے متمسک افراد انفرادی طور پر نقصان اٹھاتے رہنے کی بجائے باہم اکٹھے ہو جائیں، اس فکر کو پھیلا پھیلا کر ہم خیال جمع کرتے جائیں۔ اور اس طرح نئے قرآنی معاشرے کی طرح ڈالیں۔

آپ عرصے سے طلوع اسلام پڑھ رہے ہیں اور اس کے ہم خیال ہیں۔ آپ کے گاؤں آپ کے شہر میں اور لوگ بھی ہونگے جو اسی طرح طلوع اسلام کے ہم خیال ہوں گے۔ ان سے ملئے مل بیٹھئے۔ اور سوچئے کہ آپ اس فکر کو کیسے آگے بڑھا سکتے ہیں اگر ایسے ہم خیال آپ کے آس پاس موجود نہیں ہیں تو ایسے لوگ تو یقیناً ملیں گے کہ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ موجودہ معاشری عذاب سے بچنے کے لئے یہ صورت ہے جو طلوع اسلام پیش کر رہا ہے، تو وہ آپ کا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کے ہم خیالوں کا سلسلہ پیدا ہو جائے گا۔ یہی حلقہ بزم طلوع اسلام کہلائے گا اور ایسی بزمیں مل کر وہ معاشرہ قائم کریں گی جو افراد کے لئے جنتی زندگی کا ضامن ہو گا۔ اٹھئے۔ آس پاس کا جائزہ لیجئے اور بزم طلوع اسلام کی تشکیل کی کوشش شروع کر دیجئے۔

واہ چھاؤنی محمد اسحق خاں صاحب کوارٹر نمبر ۴۲۱ ۔ ۸ / ۴ واہ چھاؤنی بزم کی تشکیل میں کوشاں ہیں۔ مقامی قارئین ان سے رابطہ پیدا کریں اور بزم کی تشکیل میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

نقد و نظر

سید احمد شہیدؒ مرتبہ محترم غلام رسول صاحب قہر شائع کردہ کتاب منزل لاہور

جلد اول ضخامت ۴۰۹ صفحات، جلد دوم صفحات ۴۰۸۔ دونوں جلدیں یکجا مجلد۔ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد ۱۲ روپے۔

اقبال نے طرابلس کی ایک مجاہدہ بچی کے ایک جانفروشانہ کارنامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صد حیرت و تعجب سے کہا تھا کہ

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

یہ تو سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس کا ذکر ہے اور واقعہ ہے انفرادی لیکن اگر ہم پچھلی صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے آتش کدہ ہمہ تن خاکستر کو دیکھیں تو اس میں ہمیں ایک ایسی برق در آغوش "چنگاری" ملتی ہے جو دلولۂ جہاد سے شہاب ثاقب بن کر اٹھی۔ باطل کے خرمن خار و خس پر برق خاطف بن کر گری۔ لیکن خود اپنوں کی ملت فروشیوں کے صدقے شعلۂ مستعجل کی طرح ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئی۔ یہ ہمہ تن سوز "چنگاری" تھی، مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ کی جن کے جذبۂ جہاد نے بتایا کہ ایک مرد مومن کا یقین کامل اور ایمان محکم نہایت بے سروسامانی کے عالم میں بھی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ حضرت سید احمد کی زندگی اور ان کی تحریک جہاد کی تفصیلات قوم کی نگاہوں سے اوجھل تھیں کہ سنہ ۱۹۳۹ء میں سید ابوالحسن صاحب ندوی نے سیرت شہید کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب پر طلوع اسلام بابت اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہے۔ جس میں کتاب کے مندرجات کے علاوہ خود اس حیات پرور تحریک کا بھی تعارف کرایا گیا تھا۔ لیکن وہ کتاب بہت مختصر تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صاحب فکر و نظر اس پر تحقیق کا کام کرے اور اس تصویر کے مختلف گوشوں کو تفصیل سے سامنے لائے۔ اس کے بعد ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی اور اطمینان ہوا کہ محترم غلام رسول صاحب قہر (جو کبھی زمیندار اور انقلاب والے قہر۔ یا یوں کہئے کہ غالب والے قہر صاحب) اس پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ قہر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جس کام کے پیچھے لگتے ہیں نہایت صبر، برداشت، ضبط اور خاموشی سے اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے اس میں شبہ نہیں کہ ہماری بے تابی کتنا شکوہ سنج تھی کہ قہر صاحب اس تحقیق کی تکمیل میں اتنی تاخیر کیوں کر رہے ہیں۔ لیکن ان بے تابیوں سے وہ صبر طلبی عشق کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے دینے والے نہیں تھے۔ چنانچہ چودہ پندرہ برس کی دیدہ ریزی کے بعد قہر صاحب اس داستان روح پرور و حیات بخش کو باہمہ اطناب و تفصیل ہمارے لئے (اور ہماری طرح ہزارہا منتظرین کے لئے) وجہ شادابی قلب و نظر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم محترم قہر صاحب کی خدمت میں ان کی اس قابل رشک کامیابی پر دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کتاب منزل کو بھی درخور مبارکباد سمجھتے ہیں جنہوں نے اتنی ضخیم کتاب کو شائع کرنے کی ہمت کر لی۔ اگرچہ جی چاہتا تھا کہ یہ کتاب اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوتی لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس ملک میں اعلیٰ پیمانے پر شائع شدہ کتابوں کی قیمت دینے والے بہت کم ہیں۔ ہم ان تمام صاحب ذوق حضرات سے جو اپنے داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے متمنی ہیں پرزور سفارش کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو اس سرگزشت ایمان و عمل کے مطالعہ سے محروم نہ رکھیں۔

مرقع چغتائی قریب پچیس سال ادھر کا ذکر ہے کہ مصور مشرق محترم عبدالرحمٰن صاحب چغتائی نے "مرقع چغتائی" کے نام سے دیوان غالب کا مصور ایڈیشن شائع کیا جس نے شرق و مغرب دونوں میں دیدہ ور نگاہوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ نادر مرقع ایک عرصے سے نایاب تھا۔ اب چغتائی صاحب نے ہمت کی اور اسے دوبارہ اسی آب و تاب سے پھر شائع کر دیا اس دور میں جبکہ متاع ذوق کا افلاس قدم قدم پر نمایاں نظر آتا ہے اس قسم کا اقدام فی الحقیقت ہمت طلب تھا اور اس پر وہی جذبۂ جنون آمادہ کر سکتا تھا جو ایک حقیقی فن کار کو اپنے فن کی گہرائیوں میں جذب رکھتا ہے اور اسے اس جہان سود و زیاں سے دور لے جاتا ہے۔ قیمت اس مرقع کی صرف پچیس روپے ہے اور (غالباً) خود چغتائی صاحب سے (شیش محل، راوی روڈ، لاہور کے پتہ سے) مل سکتا ہے۔

جہاں تک چغتائی صاحب کے فن کا تعلق ہے ہمیں بھی حضرت علامہ اقبال کی ہمنوائی میں کہنا پڑتا ہے کہ "بدقسمتی سے میں اس مرقع پر فنی انتقاد کا اہل نہیں ہوں"۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ جس مجموعہ میں غالب کا کلام، چغتائی کی قلمکاری اور اقبال کا تعارف یکجا موجود ہو اس دنیائے سوز و ساز اور جہان رنگ و نقطہ میں اس سے زیادہ حسین امتزاج شاید کہیں اور مل سکے۔

یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ نادرۂ روزگار ہستیوں کو دنیا میں ہمیشہ قبل از وقت بھیج دیتی ہے، اس سے ہوتا یہ ہے کہ نامساعدت زمانہ کے خونخوار ہاتھ ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور اسے کہیں سو دو سو سال بعد جا کر اس کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے کیا کر دیا! غالب یہ کہتا ہوا مر گیا کہ "قدر شعر من بہ گیتی بعد من خواہد شدن" اور آج سو سال کے بعد جا کر معلوم ہوا کہ وہ کس قدر سچ کہتا تھا۔ اقبال یہ کہتا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا کہ "غریبم در میان محفل خویش" اور ابھی شاید سو برس اور لگیں جب دنیا کو معلوم ہو کہ یہ غریب شہر کیا کیا سخنہائے گفتنی کہہ گیا ہے۔ یہی صورت غریب چغتائی کی ہے۔ لیکن کہیں یہ بھی تو حقیقت نہیں کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہوتی ہی نامساعدت حالات میں ہے؟ اف کتنی بڑی قیمت ہے جو فطرت قلب و نظر کی گہرائیاں عطا کر کے، انسان سے وصول کرتی ہے اور حقیقت شناس انسان ہے کہ وہ اس سودے کو بھی بہت سستا سمجھتا ہے۔ یہیں فطرت کو انسان کے ہاتھوں شکست ملتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

بین الاقوامی جائزہ

بین الاقوامی توجہ بہت حد تک بنڈونگ میں منعقد ہونے والی ایشیائی افریقی کانفرنس پر مرکوز رہی۔ اس کانفرنس میں پانچ کولمبو ممالک کے علاوہ جو داعیان کانفرنس تھے ۲۴ دیگر ممالک ایشیاء و افریقہ شریک ہوئے۔ ترکیب و ہیئت کے اعتبار سے یہ کانفرنس بھان متی کا کنبہ تھی۔ اس میں شریک ہونے والے کسی واضح متفق علیہ مقصد کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ یہ دراصل چال تھی پنڈت نہرو کی۔ وہ ایک طرف سرخ چین کو ایک عظیم بین الاقوامی اجتماع میں لا بٹھانا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اقوام سے متعارف ہو جائے۔ اور دوسری طرف دنیا بھر کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ چین سے عالمگیر امن کو کوئی خطرہ نہیں اور اگر ہو بھی تو وہ خود ثالثی کے معاملے کرانے کے لئے تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے" اور "استعماریت مردہ باد" کے نعرے خصوصیت سے بلند کئے جانے لگے۔ ہندوستان ان نعروں کے توسط سے ایشیائی اور افریقی اقوام کو اپنا ہم نوا بنانا چاہتے تھے۔ اور اس ہمنوائی کی مدد سے اقوام مغرب کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔

اتفاق کی بات کہ پنڈت جی کا سارا کھیل بگڑ گیا۔ کیونکہ پاکستان، ترکی، لیبیا، عراق، فلپائن، تھائی لینڈ، سیلون وغیرہ ممالک کی مساعی اور تعاون سے استعماریت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا مسئلہ بھی لا کھڑا کر دیا گیا۔ اور فضا ایسی پیدا ہو گئی کہ پنڈت جی کی خواہش اور کوشش کے باوصف، اس کی بھی مذمت کی گئی۔ اس سے پنڈت نہرو بڑے برافروختہ ہوئے۔ لیکن وہ کانفرنس کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے البتہ اس صورت حال سے اپنا پینترا بدلا اور ہمہ تن ملائمت بن کر شرکائے کانفرنس کو یقین دلایا۔ کہ ان کے عزائم امن پسندانہ ہیں۔ اور ہر چند انھوں نے اپنے مسائل کو کمیونزم سے حل کیا ہے، وہ اسے دوسروں پر مسلط نہیں کریں گے۔ ان کی بردباری اور شیریں گفتار کا اثر ایک حد تک ہوا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ اکثر ممالک نے بعد میں یہ شبہ کا اظہار کیا کہ چین دوسرے ممالک میں مداخلت سے باز نہیں آئے گا۔ اور اشتراکیت کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کانفرنس نے ہر قوم کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا کہ وہ علاقائی دفاعی تنظیمیں قائم کر سکتی ہیں۔

چین نے جہاں میٹھی میٹھی باتیں کیں، وہاں یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ فارموسا سے متعلق امریکہ سے براہ راست گفتگو کے لئے تیار ہے۔ فارموسا سے متعلق تعطل پیدا ہو گیا تھا، اسے اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔ تو چین نے اس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا روس نے ایک دس قومی کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ لیکن اسے امریکہ نے مسترد کر دیا تھا۔ کیونکہ اس میں نیشنلسٹ چین نہیں تھا۔ اب چین کی تجویز سے یہ امید ہو چلی ہے کہ شاید باہمی مذاکرات سے جنگ تک نوبت نہ آئے۔ امریکہ میں اس کا خیر مقدم ہوا ہے۔ اور مسٹر ڈلس وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی نگرانی میں مذاکرات پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔

عالم اسلامی

بنڈونگ میں ایشیائی افریقی کانفرنس کے سلسلے میں جو ممالک اسلامیہ جمع ہوئے۔ وہ آپس میں بہ حیثیت مسلمانوں کے تو نہیں ملے لیکن ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ نتیجہ تو ضرور نکلا ہے۔ مصر کے کرنل ناصر صاحب نے دیکھا کہ جب فلسطین کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو ترکی اور پاکستان پوری طرح ان کے موید تھے لیکن ہندوستان جس کا وہ ساتھ دیتے چلے آتے ہیں۔ ان کا ہم نوا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ناصر صاحب کا دل پنڈت نہرو کی طرف سے قدرے کھٹا ہو گیا ہے۔

اس کانفرنس نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ ہر ملک اپنے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق علاقائی دفاعی تنظیمیں بنانے میں آزاد ہے۔ گویا پاکستان، ترکی، اور عراق سے معاہدہ کرنا اور دیگر ممالک عربیہ کو اس میں شرکت کی دعوت دینا، کانفرنس کے نزدیک متفقہ طور پر جائز ہے۔ اگر کرنل ناصر اسے ٹھنڈے دل سے سوچیں تو اب ان کے پاس اس معاہدے کی مذمت کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ انھوں نے بنڈونگ میں دیکھ لیا ہے کہ پاکستان ان کا پوری طرح ہمنوا ہے۔ اسی طرح ترکی بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسرائیلی جارحیت میں ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ ان حالات میں مصر اور ممالک عربیہ کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ ایک ہی معاہدے میں منسلک ہو جائیں۔ اور کسی نئی تنظیم کے فریب میں آکر وحدت اسلامی کو نقصان نہ پہنچائیں۔

امریکہ البتہ جھجکتا ہے کیونکہ وہ یہ ضمانت چاہتا ہے کہ چین واقعی صلح کی مخلصانہ خواہش رکھتا ہے۔ اس کے جاسوسوں کی اطلاع یہ ہے کہ چین فارموسا پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اور امن کی باتیں اس لئے کر رہا ہے کہ فریق مخالف دھوکہ میں مبتلا ہو کر غافل ہو جائے۔

چین کی طرح روس بھی دنیا کو امن پسندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ حال ہی میں آسٹریا کے چانسلر راب کو ماسکو بلا کر معاہدہ امن کا چکر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اقوام مغرب کو دعوت دی کہ وہ اس معاہدے سے متعلق ویانا میں کانفرنس منعقد کریں۔ یہ کوشش دراصل اس لئے کی گئی ہے کہ مغربی جرمنی اب بھی اقوام مغرب سے پوری طرح نہ مل سکے۔ چنانچہ مغربی جرمنی میں ایک حد تک یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ شاید روس کی پالیسی بدل گئی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ جرمنی کی وحدت کی شکل پیدا ہو جائے۔ روس نے اب تک سر توڑ کوشش کی ہے کہ اقوام مغرب معاہدات پیرس کی تصدیق نہ کریں۔ اس نے انگلستان اور فرانس کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تصدیق کی گئی تو وہ ان سے اپنے معاہدے منسوخ کر دے گا۔ لیکن اب اس کا رویہ الٹ ہو گیا ہے۔ اور تصدیق کے باوجود وہ دول اربعہ کے وزرائے خارجہ کی ملاقات کی کوشش کر رہا ہے۔ مارشل بلگانن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ صدر آئزن ہاور اور وزیر اعظم ایڈن سے ملنے کے لئے تیار ہیں۔ امریکہ اس فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا موقف یہ ہے کہ پہلے ان ممالک کے سفیر آپس میں ملیں اور پھر وزرائے خارجہ۔

کرنل ناصر صاحب کے خیالات میں تبدیلی کے آثار ضرور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی یہ کہا کہ مسلمان آخر مسلمان ہیں اور وہ بہرحال ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہ اعتراف خوش آئند ہے۔ شاید اسی کی بدولت کرنل ناصر صاحب نے یہ پیشکش کی ہے کہ وہ افغانستان اور پاکستان کے مابین مصالحت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حالانکہ اس سے پیشتر جس طرح افغانستان اور وہ ہندوستان کے ہمنوا تھے، وہ اسے نظر انداز کر جاتے۔ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ افغانستان کے تین روزہ قیام میں اس موضوع پر کابل کے حکمرانوں سے بات کر بھی آئے ہیں۔

اس ہفتے شام اور سعودی عربیہ کے وزرائے خارجہ پاکستان آئے ہیں۔ یہ ہر دو حضرات بنڈونگ کانفرنس میں شریک تھے۔ ان کا پاکستان آنا خوشگوار نتیجے پیدا کر سکتا ہے اگر انھوں نے بھی مصر کی طرح بنڈونگ کانفرنس کا شاہدہ آنکھیں کھول کر کیا ہے۔ تو وہ بھی یقیناً اسی نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ ان کا فائدہ مسلمانوں سے ملنے میں ہے اور ترکی اور پاکستان ممالک اسلامیہ کو متحد کرنے کی جو عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ مخلصانہ ہیں۔

ایران میں وزارت بدل چکی ہے۔ اب جنرل زاہدی کی بجائے مسٹر اعلیٰ وزیر اعظم بنے ہیں۔ یہ تبدیلی ایران کے مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں شرکت سے متعلق بتائی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نئے وزیر اعظم پاکستان اور ترکی کے معاہدے کے پرجوش حامی ہیں۔

یہ آثار بڑے خوش آئند ہیں۔ اگر قائدین عالم اسلامی ذرا عقل و ہوش سے کام لیں۔ تو ممالک اسلامیہ کا ایک بلاک آن واحد میں قائم ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو جائے تو تاریخ اسلامی میں ایک باب کا افتتاح ہو گا۔

مسلمانوں کی گاڑی کے صراط مستقیم سے اتر جانے کا نتیجہ ہے کہ ہمیں انھیں متحد کرنے کے لئے اس قدر اپیلیں کرنی پڑ رہی ہیں۔ ورنہ جس اسلام نے " الف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" کے اعلان سے ایک رشتہ مواخات میں منسلک کر دیا تھا اگر یہ اسی اسلام سے وابستہ رہتے تو اس کا کوئی تصور بھی کر سکتا تھا کہ یہ الگ الگ ہوتے؟ کبھی ایک آئیڈیالوجی کے حامل الگ الگ بھی ہوا کرتے ہیں؟ لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ اسلام کو چند رسمیات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس کی آئیڈیالوجی بکھر بکھر کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس کا علاج اس آئیڈیالوجی کو پھر سے سامنے لانا ہے۔ اور یہ آئیڈیالوجی قرآن کو سامنے لانے ہی سے سامنے آسکتی ہے۔

(لمعہ و نظر ص ۱۵ سے آگے)

کلیات ولی (طبع سوم) مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نمبر ۱
ضخامت ۳۸۲ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔

ولی دکن کا قدیم ترین اردو شاعر ہے۔ اس کا مجموعہ کلام کلیات ولی سب سے پہلے سنہ ۱۲۴۹ھ میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی کے اہتمام سے پیرس میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۲۹۱ھ میں بمبئی سے مطبع حیدری نے، سنہ ۱۳۱۲ھ میں منشی نول کشور نے لکھنؤ سے اور سنہ ۱۳۱۲ھ میں حیدر سایانی نے پونا سے اور آخر میں سنہ ۱۳۴۵ھ مولانا احسن مارہروی مرحوم نے بڑی تحقیق و تفتیش اور طویل مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی طرف سے شائع کرایا۔ مولانا احسن مارہروی کے مرتبہ دیوان کا دوسرا اڈیشن انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب سے سنہ ۱۹۴۵ء میں مزید اضافہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کرا کے دہلی سے شائع کیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو قیامت برپا ہوئی اس میں مسلمانوں کی جان و مال کی تباہی کے ساتھ ساتھ دوسرے کتب خانوں کی طرح انجمن ترقی اردو کا قیمتی اور نادر کتب خانہ بھی لٹیروں کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا اور انجمن کے مطبوعہ اور قلمی نسخے بھی ضائع ہو گئے، جس میں کلیات ولی طبع دوم کے نسخے بھی شامل تھے۔ اب انجمن ترقی اردو پاکستان نے کلیات ولی کا تیسرا ایڈیشن ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ تیسرے ایڈیشن کے مرتب بھی ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ہیں۔ زیر نظر ایڈیشن پہلے دونوں ایڈیشنوں سے زیادہ کارآمد اور قابل اعتماد ہے۔ اس کی صحت اور حسن ترتیب و تدوین کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں ولی دکنی کی انھیں غزلوں، فردیات، رباعیات، مخمسات، مستزاد، قصائد، ترجیع بند، مثنویات اور قطعات کو شامل کیا گیا ہے، جن کے متعلق مرتب نے اچھی طرح چھان بین کر لی ہے۔ اور اس کا مقابلہ دوسرے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے کر لیا ہے۔ اس اڈیشن میں ضمیمے کے طور پر ایسی غزلوں کو شامل کر دیا گیا ہے جو صرف کسی ایک نسخے میں ملتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں متروک اور غریب الفاظ کی ایک فرہنگ شامل کر دی گئی ہے، جس سے ایڈیشن کی افادیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ولی کے حالات زندگی پر مرتب کا مضمون کافی معلومات افزا ہے۔

چونکہ قوموں کا لٹریچر ان کی ہلی حیات (اور موت) کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس کا تحفظ اس مقصد کے لئے بڑا مفید ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں دیکھ سکیں کہ ہمارے اسلاف کن وادیوں سے گذرے ہیں۔ اور ان کے سفر زندگی کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ اس اعتبار سے انجمن ترقی اردو کے اس قسم کے اقدام حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

باب المراسلات (ص سے آگے)

کر دی گئی تھی۔ ہم مستفسر اور دیگر قارئین کی توجہ ۵ر فروری سنہ ۱۹۵۵ء کی اشاعت کے باب المراسلات کی طرف منعطف کراتے ہیں۔ اور یہ چیز صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں۔ ہم خود مقام سنت کے متعلق اپنے مسلک کو اس وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ اس کے بعد متلاشیان حقیقت کے لئے کسی شبہ یا ابہام کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے لئے ۲ر اپریل سنہ ۱۹۵۵ء کے لمعات ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے بعد آپ خود سمجھ لیجئے کہ جماعت اسلامی اور ان کے ہمنوا طلوع اسلام یا محترم پرویز صاحب کے متعلق جو کچھ کہتے رہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت | از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد معہ گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم | از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصہ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان | اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام | اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام | از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ دل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے | روز مرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

اسباب زوال امت | از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۴۸ صفحات قیمت۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے | ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول | یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں۔ اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول اور مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث | حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یک جا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

فردوس گم گشتہ | از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطہ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۲ قیمت چھ روپے

نوادرات | از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت | (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے۔

نظام ربوبیت | (از پرویز) انسان کے معاشی مسئلہ کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت ساڑھے سو صفحے۔ قیمت قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم چار روپے۔

اقبال و قرآن | (از پرویز) علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

نوٹ:- تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴۳۔ کراچی

سُنّت رسُول اللہؐ

۲۰؍ اپریل کے طلوعِ اسلام میں عنوانِ بالا پر ایک مبسوط مقالۂ افتتاحیہ شائع کیا گیا تھا جس میں سنّتِ نبی اکرمؐ کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک واضح کرنے کے بعد، ملک کے تمام ذمہ دار افراد اور اداروں سے گزارش کی گئی تھی کہ اگر وہ اس مسلک میں کوئی غلطی دیکھیں تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیں۔ ان میں جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے خاص طور پر خطاب کیا گیا تھا اور محترم امین احسن اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کو الگ خطوط بھی لکھے گئے تھے۔ اس وقت تک نہ اِن حضرات کی طرف سے اور نہ ہی کسی اور صاحب کی طرف سے ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے، لیکن طلوعِ اسلام کے خلاف گالیوں کا جو سلسلہ ان حضرات نے ایک عرصہ سے شروع کر رکھا ہے وہ برابر جاری ہے۔

چونکہ دین میں سُنّت رسول اللہؐ کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے گذارش کریں گے کہ وہ ان حضرات سے کہیں کہ وہ اس اہم موضوع پر علمی انداز سے گفتگو کریں اور جو کچھ طلوعِ اسلام نے لکھا ہے اس کا جواب عنایت فرمائیں تاکہ یہ اہم اور بنیادی مسئلہ واضح اور صاف ہو جائے۔

اردو اسٹینوگرافر کی ضرورت

طلوعِ اسلام کے لئے ایک اچھے اردو اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔
تنخواہ اور تقرری کا فیصلہ ٹیسٹ کے بعد ہوگا
ضرورت مند حضرات فی الفور ناظم ادارہ سے ملاقات کریں۔
بیرونی حضرات کو اپنے خرچ پر ٹیسٹ کے لئے کراچی آنا ہوگا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
کراچی

عورت کا قرآن

ہمیں افسوس ہے کہ "عورت کا قرآن" اس اشاعت میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ اس کی بارھویں قسط آئندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

مدیر

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا نادر مجموعہ
۴۰۰ صفحات — قیمت چار روپے

سو برس پہلے

اپنی دولت خفیہ مقامات پر دفن کرنے کی غیر مفید حرکت تو سال پہلے بہت عام تھی جدید دنیا کی بہت سی دوسری آسائشوں کی طرح مفید طور پر روپیہ لگانے کی سہولتیں مہیا نہ تھیں۔
اس وقت ڈاکخانہ کا سیونگ بینک آپ کو اس بات کی جملہ آسانیاں فراہم کرتا ہے کہ آپ اپنا روپیہ محفوظ طور پر جمع رکھ سکیں اور اس پر معقول منافع حاصل کرتے رہیں۔

* رقم بالکل محفوظ
* روپیہ جمع کرنے کا طریقہ سہل اور سادہ
* کھاتے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ مُفت تبادلہ۔
* نفع پر انکم ٹیکس معاف
* روپیہ نکالنے کی سہولت
* اچھا منافع جس کی شرحیں ۱½ فیصدی سے ۳ فیصدی تک ہیں۔

مختلف قسم کے کھاتے مہیا ہیں۔
معمولی کھاتہ — مشترک کھاتہ — میعادی کھاتہ
تمام پاکستان میں ۳,۵۰۰ سے زائد شاخیں پھیلی ہوئی ہیں

پوسٹ آفس سیونگز بینک
میں روپیہ جمع کیجئے

UNITEL — SFP 7/55 (B)

سنت رسول اللہؐ (پمفلٹ)

طلوعِ اسلام کی ۲۰؍ اپریل کی اشاعت میں جو دو مقالے "سنت رسول اللہؐ" اور "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" شائع ہوئے تھے، انہیں بزمہائے طلوعِ اسلام کے تقاضے پر ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے (ان میں ایک مضمون "دینِ خداوندی" بھی شامل کر دیا گیا ہے)۔ اس پمفلٹ کی ضخامت ۴۸ صفحات ہوگی۔ اور محض لاگت پوری کرنے کے لئے اس کی قیمت فی نسخہ ۲ آنے رکھی گئی ہے۔ بزمیں اور دیگر خواہشمند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر بہت جلد فرمائشیں بھیجیں۔

ترجمان بزم طلوعِ اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳
کراچی

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح ـ ـ ـ

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ھے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاھیں وہ دے سکتے ھیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۷۔ کراچی۔ ۳

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از- پرویز)

شائع ھوگئی ھے۔ اس میں بتایا گیا ھے کہ قرآن کی رو سے
اس زمین پر انسان کے سب سے اھم سوال۔ یعنی

معاشی مسئلہ

کا حل کیا ھے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رھی
ھے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ھے۔
رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ھے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ھے۔
چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ھے اس لئے اسے
دو قسموں میں شائع کیا گیا ھے۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش- چھہ روپے
قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف ڈسٹ کور کے ساتھ- چار روپے
دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ھے۔

بہت جلد فرمائشیں بھیجیں- جن حضرات کی پیشگی رقم جمع ھے اُنھیں
قسم اول از خود بھیجدی جائیگی- اگر وہ کتاب نہ لینا چاھیں یا قسم
دوم لینا چاھیں تو بہت جلد اطلاع بھیجدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی-۳